جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب .... تسمیۃ القرآن

مصنف .... پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

پروف ریڈنگ .... عبدالجبار قمر، محمد علی قادری

اشاریہ وتخریج .... عبدالجبار قمر

کمپوزنگ .... غلام نبی، محمد سلیم حسن، محمد یامین

نگران طباعت .... محمد جاوید کھٹانہ

اشاعت اول .... مئی، ۱۹۸۱ء

اشاعت دوم .... مارچ، ۱۹۸۳ء

اشاعت سوم .... جون، ۱۹۸۴ء

اشاعت چہارم .... جولائی، ۱۹۸۵ء

اشاعت پنجم .... مئی، ۱۹۹۵ء

اشاعت ششم .... دسمبر، ۲۰۰۰ء

تعداد ۱۱۰۰

مطبع .... منہاج القرآن پرنٹرز

قیمت .... روپے

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے ریکارڈ شدہ آڈیو/ ویڈیو کیسٹس سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلی کیشنز

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش
www.MinhajBooks.com

انتساب

یہ کتاب جو ''تسمیۃ القرآن'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے درحقیقت قرآن مجید کی زیر تالیف تفسیر ''منہاج القرآن'' کا حرف آغاز ہے۔ میں اس حرف آغاز سے ہی ''منہاج القرآن'' کا انتساب اس وجود مسعود کے نام کرتا ہوں جس کے توسط سے عالم انسانیت کو ''قرآن'' نصیب ہوا، جس پیکر حسن و جمال کا خلق سراپا قرآن اور نطق بیانِ قرآن تھا۔ جس کا دل مہبطِ قرآن اور زبان مصدرِ قرآن جس کی ادا امرادِ قرآن اور حیات مفہومِ قرآن تھی۔ جس کا حکم امر قرآن اور منع نہی قرآن تھی۔ جس کی نبوت سند قرآن اور رسالت پیغامِ قرآن تھی اور آج تک جس کا مرکز ہدایتِ قرآن اور راستہ منہاج القرآن ہے۔ یعنی وہ امام المرسلین سیدنا و مولانا محمد النبی الامی الرؤف الرحیم الجواد الکریم (فداہ روحی و قلبی و قرت عینای بتربۃ نعلیہ ﷺ) ہیں۔

اس لئے میں اپنی زیر تالیف تفسیر ''منہاج القرآن'' کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جزو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عزوشرف

میں اپنی بے علمی و کم مائیگی کے پیشِ نظر یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اتنے بڑے کام کا آغاز کروں گا لیکن یہ سب ان ہی کے لطف و کرم اور فیضان و عنایت کا ثمرہ ہے کہ میں نے خدا کا نام لے کر اس کارِ عظیم کو شروع کر دیا ہے۔ اب میں آپ ﷺ ہی کی رحمت اور نظرِ شفقت کی طرف متوجہ ہوں جو پہلے بھی باری تعالیٰ کے فضل و احسان اور توفیق و انعام کا باعث رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

قارئین کو میری اس کاوش میں اگر کوئی حسن و خوبی کا پہلو دکھائی دے تو وہ محض توفیقِ ایزدی جل مجدہ اور رحمت نبوی ﷺ کی وجہ سے ہو گا اور اگر کوئی سہو و خطا کا پہلو ہو تو وہ محض اس بے علم و کم آگاہ کی اپنی وجہ سے ہو گا' چنانچہ وہ اس سے درگزر کرتے ہوئے تجویز اصلاح اور دعائے خیر فرمائیں۔

اے باری تعالیٰ! میں نے خدمت قرآن کے اس کام کا آغاز تیری رضا کی خاطر تیرے حبیب ﷺ کی خدمت میں ہدیہ نیاز پیش کرنے کی غرض سے کیا ہے، تو اسے اپنی بارگاہ عافیت پناہ میں منظور فرما۔ اسے دربار مصطفوی ﷺ میں ''ہدیہ مقبول'' کا شرف عطا کر اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت و توفیق مرحمت فرما۔ میرے فہم و بیان کی خطا کو معاف کر اور مجھے اخلاق و انشراح کی دولت سے بہرہ یاب فرما۔

(رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَ يَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ)

خاکپائے علماء
(ڈاکٹر) محمد طاہرالقادری

www.MinhajBooks.com

تقدیم

از

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ

دینی اعتبار سے ہماری حیات قومی کا زوال اس طرح نمایاں ہے کہ آج تبلیغ اسلام سے جتنی تعداد میں لوگ اسلام کو قبول کرتے ہیں۔ دوسرے افکار ونظریات کی تبلیغ کے باعث اس سے زیادہ تعداد میں ارتداد والحاد کی طرف راغب ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صورتحال دین کامل کے اس مسخ شدہ تصور کا نتیجہ ہے جس کی رو سے دین چند مابعد الطبیعی عقائد، اخلاقی اسباق، تمدنی ضوابط، معاشرتی اصولوں، فقہی قواعد اور چند ایسی عبادات سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے جو اپنی معنویت، مقصدیت اور عملی افادیت کھو کر محض اوہام اور رسوم وظواہر میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جن کا کوئی اثر عملی زندگی پر باقی نہیں رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دعوت اسلام کے نام سے جن حقائق کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ ان کی نتیجہ خیزی کا یقین نہ خود مبلغین کو ہے نہ ان کے مخاطبوں کو، جس کی وجہ موثرات زندگی کے بدل جانے کے بعد زندگی کے ہر تقاضے کا پورا ہونا اسلامی دستور حیات کی خلاف ورزی پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔

اس صورتحال کے علاج کے لئے جب مذہبی ذہن قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مطالعہ قرآن سے آرزو غلبہ حق کی پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ غلبہ باطل کا ہوتا ہے۔ اس سے ہماری بے یقینی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی ذہن ایک تو اس یقین سے محروم ہے کہ انبیاء کی تاریخ نے نوع انسانی کو بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص کوئی ایسی وراثت بھی سپرد کی ہے۔ جس میں دور مابعد رسالت میں امت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد دوبارہ عروج حاصل کرنے کی ضمانت ہو اور دوسرے مذہبی ذہن کی دینی حمیت، قرانی ہدایت کی نتیجہ خیزی کی ضمانت کی جستجو کے لئے بیدار نہیں ہوتی۔ حالانکہ اسی زندگی میں قرآنی ہدایت کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت میسر نہ آئے تو معاذ اللہ خدائی کے سب دعوے صرف شاعرانہ تعلّی بن جاتے ہیں اور دور مابعد رسالت میں قرآن مجید وہی معروضی نتائج پیدا نہ کر سکے جو دور رسالت میں پیدا ہوئے تھے تو نہ قرآن حجت رہ سکتا ہے اور نہ ختم نبوت کا کوئی جواز باقی رہتا ہے۔

ہم نے قرآن کو صُحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کر کے اسے صرف قانون کا ماخذ تصور کیا ہے۔ جس سے دور اقتدار میں تو نتائج پیدا ہوتے رہے مگر جب ہم اقتدار سے اور اسلامی قانون،

قوت نافذہ سے محروم ہوئے تو قانون سازی بے اثر ہوگئی۔ لیکن امت کے زوال پذیر ہو جانے کے باوجود آج تک مذہبی ذہن بجز قانون سازی کے قرآن سے کوئی اور تمنا نہ کر سکا۔

مزید یہ کہ ''تکمیل دین'' کا قرآنی تصور ''تکمیل فقہ'' میں بدل گیا۔ مذہبی ذہن نے تکمیل دین کے نتیجہ میں ختم نبوت کا یہ مفہوم سمجھنے کی بجائے کہ نوع انسانی، ہدایت قرآنی اور نبوت محمدی ﷺ کے ذریعے نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز کر دی گئی ہے۔ ختم نبوت سے تکمیل دین کا تصور اخذ کیا۔ اس طرح قیادت اور دینی فکر میں ایک خلاء محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ انسانی استعداد کے زائیدہ افکار و علوم سے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی گئی اور زندگی کے کسی پہلو میں تعبیر کے بغیر نصوص کے ہدایت ہونے کا اعتماد برقرار نہ رہ سکا۔ اسی کے نتیجہ میں تفسیر، قرآن کا اور تعبیر و تاویل نصوص کا بدل بن گئی اور انسانی استعداد زائیدہ علوم نے علوم بیالوجی کی جگہ لے لی۔

عزیز گرامی قدر پروفیسر محمد طاہر القادری نے یہ باور کرانے کے لئے درس قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے کہ:

''دین کی اصل حقیقت جو انسانی شخصیت کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس کے تمام تقاضے پورے کرنے کی تدبیر کتاب و سنت سے کیونکر میسر آ سکتی ہے؟''

کیونکہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا کے باوجود توجہ کے صرف ''شرع'' پر مرکوز ہو جانے اور ''منہاج'' سے صرف نظر ہو جانے کی بنا پر ہم اس مشکل میں مبتلا ہوئے اور اس حقیقت کو بھلا دیا گیا کہ نزول قرآن کا مقصود صرف علم شرع ہی مہیا کرنا نہ تھا بلکہ زندگی کو شرع کے مہیا کردہ نمونہ فضائل کے مطابق ڈھالنے کا ''منہاج'' بھی فراہم کرنا تھا۔ موصوف نے ''منہاج القرآن'' کی طرف توجہ دلا کر اپنے درس کی بنیاد اس فکر پر رکھی ہے کہ قرآن زندگی کو پسندیدہ نمونے پر ڈھالنے کا منہاج بھی مہیا کرتا ہے۔ مجھے موصوف کے درس قرآن میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کو پیش کرنے کا جو طریقہ طاہر القادری صاحب نے اختیار کیا ہے اس سے یقین انگیزی کی وہ سب شرائط پوری ہوتی ہیں جو بالعموم اب تک نظر انداز کی جاتی رہی ہیں۔

جو خصوصیت طاہر القادری صاحب کے فکر اور طریق کار کو اب تک عمل میں آنے والی تمام مساعی سے متمیز کرتی ہے وہ محمد رسول اللہ ﷺ کو پیغمبر انقلاب اور قرآن مجید کو صحیفہ انقلاب کے طور پر نمایاں کرنا ہے۔ موصوف نے علماء اور دینی مدارس کے طلباء کے ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے لغوی اشتقاق، تفسیری، علمی اور نحوی مباحث کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور معانی و مطالب متعین کرنے میں ہر ایک کی سند قرآن مجید سے مہیا کی ہے۔ مختلف اطلاقات کی بحث میں قرآن سے دلائل پیش کئے ہیں۔ حکمت و فلسفہ کا استخراج بھی براہ راست قرآنی استدلال سے کیا ہے۔ قرآنی احکام کی

عملی حکمت و افادیت اور جدید عصری مسائل کا حل بھی قرآنی فکر سے پیش کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ احادیث نبوی ﷺ اور آثار صحابہ و تابعین سے بھی استناد کیا ہے' تاکہ قرآن سے اخذ کردہ مفاہیم کی سند صحابہ و تابعین سے بھی مل سکے۔ انہوں نے مفسرین، محدثین، فقہا، متکلمین اور اکابر مشائخ صوفیاء کی تحقیقات سے بھی استفادہ کر کے ان کی سند حاصل کی ہے اور اپنے نتائج فکر کو قرآنی استدلال و استخراج کی بناء پر پیش کرنے کے ضمن میں ماضی کے فکری و علمی ورثے سے لاتعلق نہیں ہونے دیا۔ تفسیر القرآن بالقرآن کے اسلوب کا ذکر تو مفسرین اور علماء کرتے آئے ہیں لیکن اس اسلوب کو جس طرح طاہر القادری صاحب نے اپنایا ہے اس کا اندازہ علامہ امرتسری (مدیر الاسلام) کے اس تبصرے سے ہوتا ہے کہ:

''پندرہ روزہ درس قرآن از پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب کے شمارہ ۱۱،۱۲ میرے سامنے ہیں۔ میں نے فی الحال ان کو سرسری سا دیکھا ہے۔ صاف صاف اعتراف کرتا ہوں کہ میں حیران رہ گیا، اپنی طویل عمر کا بڑا حصہ تفسیروں ہی میں گزرا ہے لیکن ایسی وسیع اور جامع العلوم تفسیر دیکھی نہ سنی۔ یہ تو ایک ادارہ کا کام تھا جسے تنہا پروفیسر صاحب موصوف انجام دے رہے ہیں .... میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالی محترم پروفیسر صاحب کو صحت مندی اور عمرِ طویل سے بہرہ یابی عطا فرمائے' تاکہ وہ اس امر عظیم کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اس کی نشر و اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر ہونی چاہئے۔''

زیر نظر کتاب کو دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتی ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کا یہ انداز بلا مبالغہ تحقیق اساسیہ میں منفرد اجتہادی مقام کا حامل ہے۔ اللہ پاک لغزشوں سے محفوظ رکھے اور شرح صدر میں اضافہ فرمائے۔

(ڈاکٹر) برہان احمد فاروقی

www.MinhajBooks.com

باب:۱

حکمت استعاذہ

۞

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ

میں (باریابی کی کامل امید رکھتے ہوئے) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں
شیطان مردود سے (جو نیکی سے دور اور حسد کی آگ میں جلنے والا ہے)

○

www.MinhajBooks.com

www.MinhajBooks.com

تفسیر تسمیہ کا آغاز حکمت استعاذہ سے کیا جارہا ہے۔ ہر چند کہ استعاذہ بسم اللہ کا حصہ نہیں ہے لیکن چونکہ تلاوت قرآن سے پہلے اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ اس لئے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تفسیر تسمیہ کے ضمن میں پہلے اس کی حکمت واضح کر دی جائے کہ استعاذہ سے مراد کیا ہے؟ اور اسے تلاوت قرآن سے پہلے پڑھنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

ان الفاظ کو اصطلاح شرع میں ''تعوذ'' یا ''استعاذہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ جملہ اپنی ترکیب اور ہیئت لفظی کے اعتبار سے قرآن مجید کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کا حکم ایک قرآنی آیت سے ماخوذ ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِO (النحل' ١٦:٩٨)	سو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود (کی وسوسہ اندازیوں) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں O

استعاذہ کی شرعی حیثیت

جمہور علماء کے نزدیک نماز کے علاوہ تلاوت قرآن سے پہلے استعاذہ مستحب ہے۔ امام خازنؒ نے اسے سنت لکھا ہے' بلکہ بعض کے نزدیک قرآنی حکم ''فاستعذ'' اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ عطاء بن ابی رباحؒ سے یہی منقول ہے۔ امام ابن سیرینؒ اسقاط وجوب کے لئے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ کا تعوذ کافی سمجھتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ قرآنی امر اس کی فرضیت اور وجوب کے لئے نہیں بلکہ ندب اور استحباب کے لئے وارد ہوا ہے۔ اس کا ترک شرعاً گناہ نہیں ہے۔ بخاری' سنن اربعہ اور مسند امام احمد میں نماز' تلاوت اور اس کے علاوہ بھی تعوذ کا معمول آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔

بعض علماء جن میں ابن سیرینؒ' ابراہیم نخعیؒ' داؤد ظاہریؒ وغیرہم شامل ہیں' نے متذکرہ بالا آیت کے ظاہر عبارت سے یہ استنباط کیا ہے کہ استعاذہ کا حکم تلاوت کے بعد کے لئے ہے۔ یہ قول مذہب مختار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ دراصل اس آیت کی ترکیب لفظی درج ذیل آیت کے مماثل ہے۔ جس میں نماز سے پہلے وضو کا حکم صادر کیا گیا ہے' ارشاد ربانی ہے۔

اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَى الۡمَرَافِقِ۔ (المائدہ ۵:٦)	جب (تمہارا) نماز کے لئے کھڑے (ہونے ارادہ) ہوتو (وضو کے لئے) اپنے شہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوؤ۔

اگر یہاں بھی صرف ظاہر عبارت کا مفہوم لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ ''جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تو اپنا منہ دھوؤ'' حالانکہ وضو قیام صلوٰۃ کے بعد نہیں بلکہ پہلے شرط ہے۔ چنانچہ اس امر کے پیش نظر تمام مفسرین بالاتفاق ''**اذا قمتم الی الصلوۃ**'' کا معنی ''**اذا اردتم القیام**'' (جب تم قیام کا ارادہ کرو) کرتے ہیں۔ یہی اصول ''آیت استعاذہ'' میں بھی کارفرما ہے۔ لہٰذا ''اذا قرأت القرآن'' کا معنی ''**اذا اردت القراۃ**'' (جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے) ہوگا۔ احادیث نبوی کے ذریعے بھی یہی مفہوم متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ محض ظاہر عبارت سے اس قول کا استدلال درست نہیں ہے۔ بنابریں استعاذہ تلاوت سے قبل ہی مستحب ہے نہ کہ بعد میں۔

تعوذ کے لئے امام سفیان ثوریؒ امام اوزاعیؒ، اورامام احمد بن حنبلؒ نے ''**اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم**'' کے الفاظ پسند کئے ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور دیگر علماء نے صرف ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' کے الفاظ کو ہی مختار قرار دیا ہے۔ دونوں اقوال میں کوئی تضاد یا تناقض ہرگز نہیں۔ جس طرح بھی پڑھ لیا جائے درست ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے۔

فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَالسَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ○ (حم السجدہ ۴۱:۳٦)	اللہ کی پناہ مانگ بے شک وہی سنتا جانتا ہے○

ان دو آیات کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں کئی مقامات پر استعاذہ کی تلقین کی گئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطَانِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ط اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ○ (الاعراف ۷:۲۰۰)	اے انسان اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ (ان امور کے خلاف) ابھارے تو اللہ سے پناہ طلب کیا کر، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے○

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ O وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنَ O

(المومنون، ۲۳: ۹۷۔ ۹۸)

میرے رب! کہو میں تیری پناہ وسوسے شیاطین سے مانگتا میرے رب! اے میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں O

ابو داؤد، ابن ماجہ اور مسند ابی یعلی میں آنحضرت ﷺ سے تعوذ کے الفاظ اس طرح منقول ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّیْطَانِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ۔

اللہ! میں شیطان سے اس کی سرکشی اور اس کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

۱۔ ابن ماجہ، کتاب اقامته الصلوة والنیته فیها، باب الاستعاذه فی الصلوة

۲۔ سنن ابی داؤد

۳۔ مسند ابی یعلی

استعاذہ کا معنی ومفہوم (التجا اور امید تکمیل)

استعاذہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے تین الفاظ کے معانی پر غور کرنا ضروری ہے۔ اعوذ، الشیطان، اور الرجیم

(۱) **اعوذ**۔ عاذ یعوذ سے متکلم کا صیغہ ہے۔ یہ ''عوذ'' سے مشتق ہے۔ جس کا معنی کسی سے التجا کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے ''عاذ فلان بفلان'' (فلاں نے فلاں سے التجاء کی) متنبّی کہتا ہے۔

یا من الوذ به فیما او مله
و من اعوذ به ممن احاذره

حافظ ابن کثیرؒ استعاذہ کا معنی یوں بیان کرتے ہیں۔

هی الالتجاء الی الله تعالی والالتصاق بجنابه من شر کل ذی شر۔

(تفسیر ابن کثیر، ۱: ۱۵)

استعاذہ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے اور ہر صاحب شر کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اس کی بارگاہ سے وابستہ ومنسلک ہو جانے کو کہتے ہیں۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں۔

العوذ، الالتجاء الی الغیر والتعلق به۔

(المفردات: ۳۵۲)

عوذ، کسی دوسرے سے التجاء کرنے اور اس سے منسلک رہنے کو کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ استعاذہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ

سے ''التجاء واستدعا'' اور اس کے دامن رحمت سے ''تعلق و وابستگی ۔'' کسی سے التجاء واستدعا کے بعد وابستگی اس ذات سے رشتہ امید جوڑ لینے کو ہی کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ التجاء واستدعا ہمیشہ کسی نہ کسی غرض اور مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ جب کوئی مستدعی کسی شخص سے اپنی التجاء بیان کر لیتا ہے تو اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی رہ سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنی التجاء کے مقصد ومدعا کے پورا ہونے کی امید قائم رہے اور کامیابی ہو' دوسری یہ کہ ناکامی ہو یعنی اس ذات سے آرزو کے پورا ہونے کی امید باقی نہ رہے۔ پہلی صورت میں ملتجی کا تعلق ملتجی الیہ سے قائم ودائم رہتا ہے۔ کیونکہ تکمیل مدعا کی امید رشتے کو بحال رکھتی ہے اور دوسری صورت میں جب کہ ملتجی کی کوئی امید باقی نہ رہے اور تکمیل مدعا کی آرزو پوری نہ ہو سکے تو وہ تعلق جو التجاء واستدعا سے قائم ہوا تھا ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ التجاء کے بعد تعلق و وابستگی کا قائم رہنا تکمیل آرزو کی امید کی دلیل ہے۔ لہذا تعوذ یا استعاذہ التجاء اور امید تکمیل دونوں کا نام ہے۔ کیونکہ تعوذ ''ذات حق سے پناہ مانگنا اور پناہ مل جانے کی کامل امید رکھنا دونوں کو شامل ہے'' اس لئے لفظ اعوذ کی معنوی وسعت پکار پکار کر بندگان خدا سے کہہ رہی ہے کہ ہر فتنہ وشر سے پناہ کی التجاء اللہ تعالیٰ سے کرو اور پھر اس کے دامن رحمت سے پر امید ہو کر وابستہ رہو' تمہیں ہر حال میں پناہ مل کر رہے گی۔ کیونکہ سوال وعطا دونوں کا مرجع ومرکز رب ذوالجلال ہے۔ ''اعوذ'' میں بارگاہ صمدیت کی کس قدر عظمت پنہاں ہے۔ آپ جتنے انہماک سے اس لفظ کی معنوی وسعت میں گم ہوں گے۔ بارگاہ الوہیت کے لطف وانعام کے اتنے ہی نظارے نصیب ہوں گے۔

(۲) دوسرا لفظ ''الشیطان'' ہے جس کے مادے کے بارے میں دو قول ہیں۔

ایک یہ لفظ ''شیطان'' شطن سے مشتق ہے اور دوسرا یہ ''شاط'' سے مشتق ہے۔ دونوں قول درج ذیل ہیں:

(۱) امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔

الشیطان النون فیه اصلیة و هو من شطن ای تباعد ۔	لفظ شیطان میں نون اصلیہ ہے اور وہ شطن سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں وہ دور رہا۔

(المفردات: ۲۶۱)

لغت عرب میں کہا جاتا ہے غربة شطون (دور کی مسافری) امیہ بن ابی الصلت' نابغہ ذبیانی اور سیبویہ نے یہ مادہ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں تشیطن فلان (کہ فلاں نے شیطانی فعل کیا) حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں صحیح یہی ہے کہ شیطان ''بعد'' کا معنی رکھتا ہے اور اسی پر کلام عرب کی بھی دلالت ہے۔

(۲) امام راغب اصفہانیؒ نے دوسرا قول بھی بیان کیا ہے۔

قيل بل النون فيه زائدة من شاط يشيط احترق غضبا' فالشيطان مخلوق من النار كما دل عليه

(المفردات:۲٦١)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ شیطان میں نون زائدہ ہے اور یہ شاط یشیط سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ''غصے میں جلنا'' ہے کیونکہ شیطان آگ کی مخلوق ہے۔ جیسا کہ (وخلق الجان من مار

(اور جنات کو پیدا فرمایا آگ کے شعلے سے)

اس معنی کے لحاظ سے شیطان حسد' بغض' عناد سے عبارت ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پہلے مادہ اشتقاق کی بنا پر شیطان رحمت حق اور نیکی سے دوری پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے مادہ اشتقاق کی بناء پر شیطان غصہ وحسد' بغض وعناد اور تکبر ونخوت کی آگ پر دلالت کرتا ہے۔

(۳) تیسرا لفظ ''الرجیم'' ہے جس کا مادہ رجم ہے۔ الرجام پتھر کو کہا جاتا ہے۔ بنا بریں الرجم۔ الرمی بالرجام (پتھر سے مارنا) کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جس پر پتھراؤ کیا گیا ہوا سے ''مرجوم'' کہتے ہیں۔ قرآن میں مذکور ہے کہ قوم نوحؑ نے تبلیغ حق کا انکار کرتے ہوئے کہا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَO

(الشعراء'۲٦:۱۱٦)

اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگسار کئے جاؤ گےO

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيَاطِيْنِ۔

(الملک'٦٧:۵)

اور بے شک ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

''الرجیم'' دراصل فعیل کے وزن پر مفعول ہے جو ''مرجوم'' یعنی مطرود عن الخیر (خیر اور نیکی سے بھگایا ہوا یا محروم کیا ہوا) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''الرجیم'' کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ فاعل کے طور پر راجم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کی وجہ لکھتے ہیں۔

لانہ یرجم الناس بالوساوس۔

(تفسیر ابن کثیر'۱:۱٦)

کیونکہ یہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِO مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِO

(الناس'۱۱۴:۵-٦)

خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سےO

لہذا الرجیم کے دونوں معنی خیراور نیکی سے دور بھگایا ہوا اور ''وسوسہ اندازی کرنے والا''
قرآن ہی سے ماخوذ ہیں۔

الشیطان الرجیم کے معنوی اطلاقات

یہ امر متفق علیہ ہے کہ استعاذہ یا تعوذ ''شیطان رجیم'' سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے اور اس پناہ کے مل جانے کی امید کا نام ہے۔ اب یہ پہلو غور طلب ہے کہ ''الشیطان الرجیم'' کا معنوی اطلاق کس شے پر ہوتا ہے۔ پہلے کی گئی لغوی معنی و مفہوم کی بحث سے کافی حد تک اس لفظ کے اصطلاحی اطلاقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ میرے نزدیک **''الشیطان الرجیم''** کے تین اطلاقات ہیں۔ جن کی تائید و تصدیق قرآن و حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ا۔ پہلا اطلاق ابلیس (فرد خاص)

''الشیطان الرجیم'' کا پہلا اور معروف اطلاق ایک مخصوص فرد پر ہوتا ہے۔ جس کا تعلق گروہ جنات سے ہے اور اس کا نام ''ابلیس'' ہے اسی کو عرف عام میں ''شیطان'' کہتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں متعدد بار آیا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ''سورہ الاعراف'' میں ہے جو آیت ۱۱ سے ۳۰ تک محیط ہے۔ ابلیس کے شیطان قرار پانے کی وجہ قرآن خود بیان کرتا ہے۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلآئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّا اِبْلِیْسَ لَمْ یَکُنْ مِّنَ السَّاجِدِیْنَ ○ قَالَ مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ط قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ○ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصَّاغِرِیْنَ ○

(الاعراف' ۷: ۱۱۔۱۳)

پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے ہوا ○ ارشاد ہوا (اے ابلیس) تجھے کس بات نے روکا تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا۔ جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے ○

اس سے آگے پھر ارشاد ہوتا ہے۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔

(الاعراف' ۷: ۱۸)

ارشاد باری ہوا (اے ابلیس) تو ذلیل و مردود ہو کر نکل جا۔

سورہ الحجر میں اسی واقعے پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ
فَقَعُوۡا لَهٗ سَاجِدِیۡنَ O فَسَجَدَ
الۡمَلٰئِکَةُ کُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ O اِلَّا
اِبۡلِیۡسَ ط اَبٰی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السَّاجِدِیۡنَ

مَعَ السَّاجِدِیۡنَ O قَالَ لَمۡ اَکُنۡ
لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِنۡ
حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍO قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا
فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ وَاِنَّ عَلَیۡکَ اللَّعۡنَةَ اِلٰی
یَوۡمِ الدِّیۡنِO

(الحجر، ۱۵:۲۹۔۳۵)

پھر جب میں اسکی (ظاہری) تشکیل کو کامل
طور پر درست حالت میں لاچکوں اور اس
پیکر (بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی)
روح پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ
گر پڑنا پس سارے کے سارے O قَالَ یٰٓا اِ
کیا o سوائے ابلیس نے فرشتوں
اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے
دیا o (اللہ نے انکار ارشاد فرمایا
اے ابلیس ! تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو سجدہ
کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا۔ (ابلیس
نے) کہا میں ہرگز ایسا ہیں (ہوسکتا) کہ بشر
کو سجدہ کروں جسے تو نے سن رسیدہ (اور)
سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے تخلیق کیا
ہے۔ (اللہ نے) فرمایا تو یہاں سے نکل جا
پس بے شک تو مردود (راندہ درگاہ) ہے۔
اور بے شک تجھ پر روز جزا تک لعنت
(پڑتی) رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو خلعت خلافت ونبوت سے سرفراز کر کے ان کی فضیلت وعظمت کا سر عام اعتراف کرنے کے لئے سجدہ تعظیمی کا حکم صادر فرمایا جسے تمام ملائکہ نے بلا تامل تسلیم کر لیا۔ لیکن ابلیس عظمت آدم کے سامنے سربسجود ہونے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بلکہ اس نے اپنے انکار کا یہ جواز پیش کیا کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ سورہ الاعراف اور سورہ الحجر کے دونوں مقامات پر یہ صراحت سے مذکور ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے ان کی فضیلت سے انکار کر دیا۔ جس پر وہ غضب الٰہی کا مستحق قرار پایا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ایک بشر جس کی تشکیل مٹی کے گارے سے ہوئی ہے مجھ سے کیونکر افضل ہوسکتا ہے۔ بارگاہ الوہیت میں یہی دلیل اس کے ملعون ہونے کا باعث بنی۔ حالانکہ بشریت آدم اور اس کی تشکیل کا ذکر کم وبیش اسی انداز میں اللہ تعالیٰ نے پہلے خود ہی فرما دیا تھا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَةِ اِنِّی خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدمی کو بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو بودار سیاہ گارے سے ہے۔

(الحجر، ۱۵:۲۸)

لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کی تخلیق کا ذکر اس انداز میں کرنا محض اظہار مقصود کے لئے تھا۔ اس میں تنقیص نہ تھی جب کہ ابلیس بشریت آدم کا ذکر صرف انکارِ فضیلت آدم کی دلیل کے طور پر کررہا تھا اور اس کا نقطہ بجائے اعتراف عظمت کے حضرت آدم کے ساتھ اپنا موازنہ تھا۔ یہ پہلو تنقیص نبوت کی طرف راجع تھا اور اس کی یہی سوچ حکم الٰہی سے انحراف کی بنیاد بنی۔ جس پر اسے ابدالاباد تک کے لئے رحمت الٰہیہ سے دور، قرب ایزدی سے محروم اور بارگاہ ربوبیت سے ملعون کردیا گیا اور قرآنی ارشاد کے مطابق وہ ''شیطان رجیم'' کا مصداق اتم قرار پاکر ہمیشہ کے لئے لعنت کا مستحق قرار پایا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے ''الشیطان'' اور ''الرجیم'' کے القاب سے یاد کیا۔ کیونکہ لفظ شیطان اپنے ایک معنی کے اعتبار سے دوری پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ابلیس کو اس نام سے موسوم کیا گیا کہ وہ تنقیص نبوت اور حکم الٰہی سے تمرد و انحراف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بارگاہ عافیت سے دور کردیا گیا ہے اور یہ لفظ اپنے دوسرے معنی کے اعتبار سے حسد وعداوت کی آگ میں جلنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ابلیس کو شیطان کہا گیا ہے کیونکہ وہ عظمت وفضیلت آدم اور منصب نبوت کی رفعت وسطوت دیکھ کر حسد وعداوت کی آگ میں جل اٹھا۔ یہاں تک کہ باری تعالیٰ کے حکم سے بھی کھلی بغاوت پر تل گیا۔ چنانچہ یہ دونوں الفاظ ابلیس کے لئے قرآن حکیم میں متفرق طور پر بھی اور اکٹھے بھی استعمال ہوئے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍO

اور قرآن شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔

(التکویر، ۸۱:۲۵)

ابلیس شیطان کیسے بنا؟

قرآن مجید کے بیانات سے ابلیس کے شیطان بننے کے تین اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ حکیم الٰہی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی بجائے اس نے اپنے عمل کی بنیاد ذاتی مشاہدے اور دلیل پر رکھی۔

۲۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی بشریت کو تنقیص نبوت کی بنیاد بنایا اور اپنا موازنہ پیکر نبوت سے کرنے لگا۔

۳۔ اس نے عظمت وفضیلت نبوت سے حسد کیا اور حسد وتکبر کی بنا پر اس کا منکر ہوا۔

۲۔ دوسرا اطلاق

''الشیطان الرجیم'' کا دوسرا اطلاق نوع انسانی اور جنات کے ان تمام افراد پر ہوتا ہے جو اپنے فکر وعمل کے اعتبار سے شیطنت کے مظاہر ہیں۔ شیطنت اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے حسد وعداوت، بغض وعناد، فتنہ وشر اور وسوسہ اندازی کی تمام صورتوں کو محیط ہے۔ اس لئے وہ تمام افراد جو ایسے خصائل ذمیمہ سے متصف ہو کر مخلوق خدا کو مصائب و آلام، فتنہ وشر اور وسوسہ وتفرقہ کی آگ میں جھونکتے پھرتے ہوں، ان کے شر سے پناہ مانگی جائے۔ قرآن حکیم جنات اور انسانوں دونوں طبقات میں سے ایسے افراد کو ''شیطان'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔

(الانعام، ۶: ۱۱۳)

اور اسی طرح ہم نے نبی کے لئے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنا دیا جو ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی (چکنی چپڑی) باتیں (وسوسہ کے طور پر) دھوکہ دینے کے لئے ڈالتے رہتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کفر وطاغوت کے ان علمبرداروں کو بھی شیطان کہتا ہے جو ہمہ وقت اہل ایمان کے اغواء واضلال میں مصروف رہتے ہیں۔

ان کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِھِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَO

(البقرہ، ۲: ۱۴)

اور جب (وہ منافق) اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں، ہم (مسلمانوں کا تو) محض مذاق اڑاتے ہیں۔

دوسرے اطلاق کے اعتبار سے ''شیطان'' متعدد افراد کا لقب ہے۔ جو ہر وقت انسانوں کو حق وصواب اور امن وآشتی سے محروم کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم ان کے اس منصوبے کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

وَاِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیَآءِ ھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ۔

(الانعام، ۶: ۱۲۲)

اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں (وسوسے) ڈالتے رہتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔

شیطانی شر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(i) پہلی صورت (وسوسہ اندازی)

پہلی صورت دل میں کوئی خیال یا وسوسہ ڈال کر کسی غلط کام کے لئے اکسانا ہے۔ جھوٹی افواہیں بھی اس قبیل سے ہیں اسی سے افراد کے درمیان غلط فہمیاں، عداوتیں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں یوں آتا ہے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ۔ (الاعراف، ۷: ۲۰)

پھر شیطان نے دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا۔

اسی طرح سورہ الناس میں فرمایا گیا ہے۔

مِنْ شَرِّالْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِO الَّذِیْ يُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِO (الناس، ۱۱۴: ۴-۶)

وسوسہ انداز (شیطان) کے شر سے جو (اللہ کے ذکر کے اثر سے) پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے O

ہماری سوسائٹی میں اس کی عملی مثال کسی کے خلاف شر انگیز اور بے بنیاد پروپیگنڈہ کرنا ہے جو کئی لوگ اپنے مذموم مقاصد کے لئے اکثر کرتے رہتے ہیں۔

(ii) دوسری صورت (جادو)

دوسری صورت جادو کے شر کی ہے۔ یہ بھی شیاطین کا کام ہے۔ اسے اسلام نے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من اتی ساحرا او عرافا فقد کفر بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کنز العمال، ۶: ۲۶۸)

جو شخص کسی جادوگر یا قسمت کا حال بتانے والے کے پاس گیا۔ پس اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی ہدایت سے کفر کیا۔

اس لئے قرآن نے جادو کے شر سے بھی پناہ مانگنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِO (الفلق، ۱۱۳: ۴)

اور گرہوں میں پھونک مارنیوالی جادوگرنیوں اور (جادوگروں) کے شر سے O

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر تکلیف اور مصیبت کو جادو یا جنات کے اثرات کی طرف منسوب کر دیا جائے، ایسا خیال جہالت کے باعث ذہنوں میں آتا ہے۔

(iii) تیسری صورت (حسد)

تیسری صورت رشک اور حسد کے شر کی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَO (الفلق، ۱۱۳:۵)

اور ہر حسد کرنیوالے کے شر سے جب وہ حسد کرےO

حسد کا شر دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ حاسد کسی کو بہتر حالت میں دیکھ کر جل اٹھے گا اور اسے نقصان پہنچانے کا کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہ کرے۔ چنانچہ اس شر انگیز کوشش سے جو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے اس سے پناہ طلب کی جائے۔ دوسری یہ کہ رشک وحسد بذات خود ایک ایسی آگ ہے جو غیر حسی اور غیر مرئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی شر انگیزی سے دوسرے شخص کو بغیر کسی ظاہری کوشش کے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی کو عرف عام میں نظر بد کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے وہم سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ فی الواقع اپنا اثر رکھتی ہے اور اسی کو شیطانی شر قرار دیتے ہوئے قرآن اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے۔ جس طرح جادو بغیر مادی محسوس اور قابل فہم ذرائع کے اپنی اثر انگیزی اور محیر العقول نتائج رکھتا ہے اور اس امر پر متعدد قرآنی آیات وواقعات اور احادیث نبوی صراحت کے ساتھ شاہد ہیں۔ اسی طرح رشک وحسد کی نظر بھی شر کا باعث ہو سکتی ہے۔

نظر شر کا ثبوت

یعقوب علیہ السلام نے اپنے جوان بیٹوں کو مصر میں غلہ لینے کے لئے بھیجا تو انہیں نصیحت کی۔

وَقَالَ یَا بَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْئٍ ط اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ عَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَO (یوسف، ۱۲:۶۷)

اور فرمایا اے میرے بیٹو (شہر میں) ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے (تقسیم ہوکر) داخل ہونا اور میں تمہیں اللہ (کے امر) سے کچھ نہیں بچا سکتا، حکم (تقدیر) صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

یعقوب علیہ السلام پیغمبر برحق ہوکر اپنے بیٹوں کو نظر بد سے بچنے کی تدبیر بتا رہے ہیں اور یہاں حکم توکل کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر میرا فرض ہے سو میں نے پورا کر دیا لیکن تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ اس لئے باوجود تدبیر کے بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت پر کرنا چاہیے۔ یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کے گیارہ بیٹے جوان، خوبصورت اور صحت مند تھے۔ انہیں ایک دروازے سے گزرتا یعنی اکٹھا دیکھ کر کوئی شیطانی خصلت کا شخص رشک وحسد کی نظر کر

سکتا تھا۔آپ نے اپنے بیٹوں کو نظر بد سے بچنے کی تدبیر بیان کر دی۔اگر نظر بد کے شر کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا تو پیغمبر خدا کبھی بھی ایسی تلقین نہ کرتے جو سراسر وہم پر مبنی ہوتی۔آنحضرت ﷺ سے حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں۔

العین حق۔ — بے شک نظر کا لگنا حق ہے۔

(صحیح مسلم، ۲:۲۲۰)

عبداللہ بن عباسؓ اور تابعین میں سے محمد بن کعب، مجاہد، ضحاک، قتادہ، سدیؒ وغیرہم سورہ یوسف کی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں۔

ذالک انھم کانوا ذوی جمال و ھیئة حسنة و منظر و بھاء فخشی علیھم ان یصیبھم الناس بعیونھم فان العین حق تستنزل الفارس عن فرسه۔

(تفسیر ابن کثیر، ۲:۴۸۴)

یعقوب علیہ السلام کا یہ ارشاد اس لئے تھا کہ ان کے بیٹے صاحب جاہ وجمال اور صاحب قوت وقامت تھے۔ پس انہیں خوف ہوا کہ کہیں لوگ ان کو نظر کے ذریعے نقصان نہ پہنچا دیں۔ کیونکہ نظر کا لگنا حق ہے۔نظر کے اثر کا تو یہ عالم ہے کہ یہ سوار کو گھوڑے سے نیچے گرا دیتی ہے۔

عظیم محدث ومفسر امام بغویؒ فرماتے ہیں۔

ذالک انه خاف علیھم العین. فامرھم ان یتفرقوا فی دخولھم لئلا یصابوا العین فان العین حق و جاء فی الاثر ان العین تدخل الرجل القبر۔

(تفسیر معالم التنزیل، ۳:۲۴۳)

اس کی وجہ یہ تھی کہ یعقوب علیہ السلام کو ان پر نظر لگنے کا خوف تھا پس انھوں نے اپنے بیٹوں کو الگ الگ داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ نظر سے بچ جائیں۔ کیونکہ نظر کا لگنا حق ہے احادیث وآثار صحابہ میں آیا ہے کہ نظر کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ یہ آدمی کو قبر میں بھی داخل کر دیتی ہے۔

اسی قسم کا ایک ارشاد آنحضرت ﷺ سے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ العین حق و لو کان شئی سابق القدر لسبقة العین و اذا استغلستم فاغتسلوا۔

(صحیح مسلم، کتاب السلام، ۲:۲۲۰)

نظر کا لگنا حق ہے۔اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت لے جاتی تو وہ نظر ہوتی اور جب تم سے غسل کے لئے کہا جائے تو غسل کر لیا کرو۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

كان يومر العائن فيتوضاء ثم يغتسل منه المعين۔

(ابوداؤد' کتاب الطب'۲:۱۸۵)

حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی کو نظر لگ جاتی تو نظر لگنے والے کو وضو کا حکم دیتے اور اس پانی سے اس شخص کو نہلا دیتے جسے نظر لگی ہوتی تھی۔

امام نوویؒ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ بنابریں جمہور علماء کا مذہب یہی ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے۔(الخازن)

اس امر کی تائید ''موطا امام مالک'' میں مروی سہیل بن حنیفؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔امام خازن' امام رازیؒ اور دیگر مفسرین نے دلائل کے ساتھ اسی مفہوم کو ثابت کیا ہے۔قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ' بیضاویؒ اور علامہ زمخشریؒ نے نظر سے پناہ مانگنے کو سنت نبوی قرار دیتے ہوئے یہ حدیث بیان کی ہے۔جس میں منقول ہے کہ حضور ﷺ اس طرح تعوذ فرمایا کرتے بالخصوص امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے لئے ان الفاظ میں استعاذہ کیا کرتے تھے۔

اعيذ كما بكلمات الله التامة من كل عين لامةو من كل شيطان و هامة۔

(جامع ترمذی' کتاب الطب' ۲:۲۷)

تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے پورے کلمات کے ساتھ ہر شیطان' ضرر رساں چیز اور برائی پہنچانے والی آنکھ سے اس کی پناہ میں دیتا ہوں۔

دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں۔

اللّٰهم انی اعوذ بكلمات الله التامه من كل شيطان و هامة و من كل عين لامةٍ۔

(ابن ماجہ' کتاب الطب' ح:۳۵۲۵)

اے اللہ! میں تیرے کامل کلمات کی پناہ مانگتا ہوں ہر وسوسہ اندازی کرنے والے شیطان سے اور ہر نقصان پہنچانے والی نظر سے۔

مذکورہ بالا احادیث وآثار سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ شیطانی اثرات میں سے ایک اثر نظر کا لگنا بھی ہے اور اس سے پناہ مانگنے کی تلقین بھی شریعت مطہرہ نے کی ہے۔اس سے بچاؤ کی تدابیر کے طریقے شرعاً تدابیر ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔جن کا اختیار کرنا جائز اور مشروع ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ تدابیر تقدیر کا بدل نہیں ہوسکتیں۔اگر اذن الٰہی یہی ہو کہ نظر سے کسی کو نقصان پہنچ کر رہے تو ضروری نہیں کہ اس تدبیر سے مطلوبہ حفاظت یقینی طور پر ہو جائے حاجة فی نفس یعقوب قضاها کا یہی معنی ہے۔

اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے پناہ مانگنے کی تعلیم فرمائی کیونکہ ہر قسم کے شر سے حفاظت کی بہترین صورت استعاذہ ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ذات کوئی امر مقدر کرتی ہے وہی اس کو بدل دینے پر بھی قادر ہے۔لہٰذا اسی سے ہر حال میں پناہ طلب کی جانی چاہئے۔

شرِ نظر کے تصور کی وضاحت چند احادیث اور علماء و مفسرین کی تحقیقات سے اس لئے کر دی گئی ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظر بد کا لگنا توہم نہیں بلکہ احادیث سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ آج کل تعقّل پسند طبقہ عقلیت کی رو میں بہہ کر ہر اس چیز کو توہم قرار دیتے ہوئے رد کر دیتا ہے جو محدود فکری وسعت، قلت مطالعہ اور ناقص عقلی استعداد کے باعث اسے سمجھ نہیں آتی۔ اس مسئلے کی تفصیلات یہاں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس لئے اس قدر بیان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

سورہ الفلق کا شان نزول بھی حسد اور جادو کے شر سے متعلق ہے۔ جب ایک یہودی جادوگر لبید بن عاصم اور اس کی بیٹیوں نے آنحضرت ﷺ پر جادو کیا تو اس ضمن میں سورہ الفلق نازل کی گئی۔ چنانچہ اس کے پڑھنے سے جادو کے جملہ اثرات زائل ہو گئے۔ واقعہ کی تفصیلات اپنے موقع پر آئیں گی۔ اس وقت صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایسے شیطانی اثرات فی الحقیقت موجود ہوتے ہیں۔ انہیں توہم کی کارفرمائی یا ضعف الاعتقادی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان پر اس انداز سے اعتقاد رکھنا کہ انسان انھیں استعمال میں لائے یا ان کی طرف راغب ہو تو یہ اسلام میں کفر و طاغوت کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا ان کے وجود کو ماننا منع نہیں۔ ان کی طرف عملاً متوجہ ہونا منع ہے۔

(iv) چوتھی صورت (جنات کا شر)

چوتھی صورت شیاطین چونکہ جنات کے ایک ایسے گروہ کا بھی نام ہے جو فاسق و فاجر، منافق، کافر اور شریر ہوتے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کو مختلف طریقوں سے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے شر سے بھی پناہ مانگنی چاہیئے۔ انسان پر جنات کا ایسا اثر جس سے اس کے عقل و حواس مختل ہو جائیں، قرآن کی رو سے ممکن ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہلاء اپنی کم فہمی کی بنا پر اور عیار و مکار لوگ اپنے مادی منافع کی غرض سے انسانی امراض و عوارض کو جنات کے شر سے موسوم کرنے لگیں۔ جس طرح ہمارے معاشرے میں سادگی اور جہالت کی وجہ سے یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ خاص طور پر امراض نسوانی کو جنات کے اثرات سے موسوم کر دیا جاتا ہے اور اس جہالت کے باعث ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اس امر کی صحت کے امکان کا تعلق ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ سود خور قیامت کے دن آسیب زدہ شخص کی طرح مختل و مبہوت ہو کر اٹھے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۔ (البقرہ، ۲:۲۷۵)	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (روز قیامت) کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان (آسیب) نے چھو کر بد حواس کر دیا ہو۔

لہٰذا شیاطین کے اس شر سے بھی پناہ مانگنا استعاذہ ہی کا حصہ ہے۔

(v) پانچویں صورت (باطل تصورات اور شیطانی عصبیتیں)

پانچویں صورت شیاطین کی ایسی گمراہی پھیلانے کی ہے۔ جس کا شعور تک انسان کو نہیں ہوتا۔ شیطان کسی معاملے میں خواہ نجی و انفرادی ہو یا مذہبی و سیاسی' ایسی منفی سوچ انسانی ذہن میں بٹھا دیتا ہے۔ جسے آدمی حق سمجھتا ہے حالانکہ وہ باطل ہوتی ہے' اور وہ شخص اس کی حمایت میں بسا اوقات کٹ مرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اعتقادی اور عملی سطح پر انسان کو گمراہ کرنے کی کاوشیں شیاطین ہمہ وقت جاری رکھتے ہیں۔ لیکن انسان کو ان کا علم تک نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم میں ہے کہ شیاطین ہر وقت تمہاری تاک میں رہتے ہیں۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمۡ هُوَ وَ قَبِيۡلُهٗ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَO	بیشک وہ (خود) اور اس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے بے شک ہم نے شیطانوں کو ایسے لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔
(الاعراف' ۷: ۲۷)	

اسی طرح شیاطین کی گمراہی پھیلانے کا ذکر اس سے آگے یوں آیا ہے۔

فَرِيۡقًا هَدٰى وَ فَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَO	ایک گروہ کو اس نے ہدایت فرمائی اور ایک گروہ پر (اس کے اپنے کسب و عمل کے نتیجے میں) گمراہی ثابت ہوگئی بے شک انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا تھا اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔
(الاعراف' ۷: ۳۰)	

چنانچہ ''الشیطان الرجیم'' کا اطلاق ایسے تمام شیاطین اور جن و انس پر ہوتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں فتنہ و شر پیدا کر کے بنی نوع انسان کا سکون و اطمینان تہ و بالا کرتے ہیں اور انھیں راہ حق و ہدایت سے بہکاتے رہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا اطلاق (شیطانی خصائل سے پناہ)

''شیطان الرجیم'' کا تیسرا اطلاق ''جنس شیطنت'' پر ہوسکتا ہے۔ جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے کہ شیطان ''شطن'' سے مشتق ہو تو اس کا معنی دوری ہوگا۔ اگر شاط' یشیط سے مشتق ہو تو اس کا معنی حسد و عداوت کی آگ میں جلنا اور کذب و باطل ہوگا۔ چنانچہ لفظ شیطان کے لحاظ سے استعاذہ کا اطلاق اس طرح ہوگا کہ میں خدا کی رحمت و ہدایت سے دوری' حسد و عداوت جیسے تمام خصائل ذمیمہ اور ہر کذب و باطل سے پناہ مانگتا ہوں اسی طرح الرجیم خواہ ''راجم'' کے معنی میں

استعمال ہو یا مرجوم کے۔ اس کا اطلاق بھی اس طرح ہوگا کہ میں بارگاہ الوہیت سے دھتکارے جانے سے پناہ مانگتا ہوں اور ہر فتنہ وشر اور سوسہ اندازی سے بھی پناہ مانگتا ہوں ۔ گویا انسان ہر اس عمل سے پناہ مانگے جو اس کو خدا کی رحمت اور قرب سے دور کردے۔ ہر وہ کام جو باطل ہو اور حق وصداقت سے متصادم ہو، شیطنت ہے اور اس سے گریز لازم ہے۔ اسی طرح انسان ہر حال میں بغض وعناد، رنج وحسد، رعونت اور کبر ونخوت جیسے رذائلِ اخلاق سے پرہیز کرے کیونکہ اس سے انسانی شخصیت نہ صرف غیر متوازن بلکہ تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔ شخصیت کو متوازن اور مضبوط بنانے کے لئے ان ذمائم سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے استعاذہ کے ذریعے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان خصائل سے اپنا دامن پاک رکھنے کی دعا کی تعلیم کی ہے اور ان رذائل کو لعنت قرار دیا ہے تاکہ انسان طبعاً ان سے آلودہ ہونے میں عار محسوس کرے۔

استعاذہ کی حکمت وفلسفہ

استعاذہ کا معنی ومفہوم اور اس کے مختلف اطلاقات سمجھ لینے کے بعد اب ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کی حکمت ومصلحت کیا ہے؟ آخر مسلمانوں کو ''شیطان رجیم'' سے خواہ وہ ابلیس ہو، شیاطین انس وجن ہوں یا خصائل ذمیمہ کی صورت میں جنس شیطنت ہو، پناہ مانگنا کیوں ضروری ہے، اس کے مقاصد ونتائج کیا ہیں؟ اس حکم کی متعدد حکمتیں ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔

پہلی حکمت (شیطانی قوتوں کے مقابلے میں الوہی حفاظت ونگہداشت کی طلب)

حکم استعاذہ کی پہلی حکمت یہ ہے کہ جب ابلیس نے بارگاہ ربوبیت میں تمرد وانحراف کی راہ اختیار کی اور اس کے نتیجے میں اسے مردود وملعون بنا کر بھگا دیا گیا تو اس نے بنی نوع انسان اور بالخصوص مسلمانوں کو راہ حق سے گمراہ کرنے کا حلف اٹھایا اور اس عزم کا اظہار اسی موقع پر برملا کر دیا۔ جس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ O
اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ O
(ص، ۳۸: ۸۲-۸۳)

(شی [illegible]
o [illegible] میں جو
(انہیں [illegible] ے
نہیں کرسکتا) o

اس کے بعد شیطان کی پیروی کرنے والوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُO لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْکَ وَ مِمَّنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَO

(ص، ۳۸: ۸۴۔۸۵)

فرمایا تو سچ یہ ہے اور میں سچ ہی فرماتا ہوں۔ (یہی) یقیناً جہنم بھر دوں گا تجھ سے اور ان سب سے جو ان میں سے تیری پیروی کریں گےo

اسی طرح ایک اور مقام پر شیطان کے اس عزم کا بیان ہے اور راسے اس دنیائے آب وگل میں اپنا کام سرانجام دینے کی آزادی اور مہلت مل جانے کا بھی ذکر ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَO اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَO

(الحجر، ۱۵: ۳۹)

ابلیس نے کہا اے پروردگار! اس سبب سے جو تو نے مجھے گمراہ کیا میں (بھی) یقیناً ان کے لئے زمین میں (گناہوں اور نافرمانیوں) کو خوب آراستہ و خوش نما بنا دوں گا اور ان سب کو ضرور گمراہ کر کے رہوں گا۔ سوائے تیرے ان برگزیدہ بندوں کے جو (میرے اور نفس کے فریبوں سے) خلاصی پا چکے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات مترشح ہوگئی کہ شیطانی طاقت نسل انسانی کو راہ ہدایت سے بھٹکانے اور گمراہی اور ضلالت کے گڑھوں میں دھکیلنے کے لئے مصروف کار ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنے ساتھ ملا لے۔ اس مقصد کے لئے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔

قرآن میں اس کا ذکر یوں آتا ہے۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَO

(الاعراف، ۷: ۱۷)

پھر میں یقیناً ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان کے پاس آؤں گا اور (نتیجۃً) تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پاؤ گے۔

ایک اور مقام پر مذکور ہے۔

www.MinhajBooks.com

لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا O وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِيْنًاO

(النساء، ۴:۱۱۸۔۱۱۹)

جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس نے کہا تھا کہ میں تیسرے بندوں میں سے ایک معین حصہ (اپنے لئے) ضرور لے لوں گا۔ میں انہیں ضرور گمراہ کردوں گا اور ضرور انہیں غلط امیدیں دلاؤں گا اور انہیں ضرور حکم دیتا رہوں گا سو وہ یقیناً اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدلا کریں گے اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنا لے تو واقعی وہ صریح نقصان میں رہا۔

جب راہ حق سے بہکانے کی کوششیں متعدد انواع واقسام کی ہوں اور کئی محاذوں پر گمراہی وضلالت کے لئے جنگ ہو رہی ہو تو ان سے بچاؤ کے لئے انسان خود کو کافی نہیں سمجھ سکتا اور پھر شیطانی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ اکثر اوقات انسان کو اپنے عقائد واعمال کی صحت وحقانیت پر یقین رہتا ہے اور وہ خود کو غلط راستے پر تصور ہی نہیں کر سکتا بلکہ دوسروں کو گمراہ قرار دیتا رہتا ہے۔ جب کسی کو اپنی گمراہی کا شعور بھی نہ ہو تو اسے راہ حق کے تلاش کرنے کی آرزو سعی اور کاوش کس طرح نصیب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ انسان اس صحرائے حیات میں جس میں ہر سو دجل وفریب اور مکر وضلالت کی آندھیاں چل رہی ہوں‘ خود کو صرف اپنی عقل وفہم کی بنا پر محفوظ و مامون نہیں کر سکتا۔ اسے یقیناً کسی ایسی ہستی کے دامن سے وابستہ ہونا ہوگا جو ہادی ہو اور اس کی ہدایت عطا کرنے کی قوت تمام گمراہیوں پر محیط ہو‘ تاکہ اس کی پناہ میں آ کر انسان کسی شیطانی ضلالت کا شکار نہ ہو سکے اور یہ معاملہ خود کو احکم الحاکمین کے سپرد کیے بغیر نہیں ہوسکتا‘ اس لئے حکم دیا گیا کہ انسان ہمہ وقت شیطانی قوت کی تباہ کاریوں اور فساد انگیزیوں سے بچنے کے لئے میری پناہ طلب کرے۔ کیونکہ مجھ پر توکل کرنے والے اور میرے دامن رحمت سے وابستہ رہنے والے شیطان کے دام تزویر میں نہیں آ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار شیطان بھی اپنے عزم وہمت کا اظہار کرتے ہوئے خدا کے برگزیدہ اور مقبول ومنتخب بندوں کے معاملے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کر رہا ہے کہ میں ہر ایک کو گمراہ کرسکوں گا لیکن اللہ کے منتخب بندے میرے دست اضلال سے محفوظ رہیں گے۔ اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَO

(النحل، ۱۶:۹۹)

بے شک اسے ان لوگوں پر کچھ (بھی) غلبہ حاصل نہیں ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

دوسری حکمت (شیطان خصلت افراد کے شر سے پرہیز)

حکمِ استعاذہ کی دوسری حکمت یہ ہے کہ اس دعا کے ذریعے انسان اپنے گردونواح میں بسنے والے بیشمار شیطانی خصلت کے حامل افراد کے شروفساد اور حسد وعداوت سے محفوظ رہے۔ کیونکہ ابلیس کے علاوہ بھی کئی افراد از قبیل جن وانس ایسے ہیں جو منفی اور تخریبی مقاصد کے لئے دوسرے لوگوں کے جائز حقوق ومفادات کو نقصان پہنچانے پر تلے رہتے ہیں۔ مخالفت ومخاصمت اور بغض وعناد کی وجہ سے دوسروں کے خلاف طرح طرح کی سکیمیں سوچتے اور منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ ایسی تمام سازشی کاوشیں دراصل شیطنت کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ باری تعالیٰ نے انسان کو ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اپنی پناہ حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

تیسری حکمت (خصائلِ ذمیمہ سے نجات اور روحانی طہارت وتزکیہ)

شیطان الرجیم چونکہ رذائل اخلاق کی مجسم صورت بھی ہے۔ اس لئے استعاذہ میں ایک حکمت یہ ہے کہ انسان خود کو بری خصلتوں اور خسیس خواہشات سے پاک رکھے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفاتی مظہریت کا اہل بنانے کے لئے اس کے باطن کو تمام ناپسندیدہ اوصاف سے منزہ کرنا چاہا ہے۔ رذائل اخلاق کی آلودگیوں سے نجات حاصل کئے بغیر انسان تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کے اوصاف کے رنگ میں رنگے جاو) کا مصداق نہیں ہوسکتا۔ عاذ یعوذ میں التجاء کرنے اور وابستہ ہونے دونوں کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے حکمت استعاذہ بھی یہی ہے کہ انسان بارگہ ایزدی میں رذائل سے پاک ہونے کی التجاء کرے اور فضائل سے متصف ہونے کے لئے اس کے دامن رحمت سے متصل ہو جائے۔ یہ التجاء واتصال اسے طہارت وپاکیزگی بھی عطا کرے گا اور عظمت وفضیلت کے اعلیٰ مقام پر بھی فائز کرے گا۔ گویا استعاذہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ استغفار ہے۔

چوتھی حکمت (شقاوت وبدبختی سے توبہ اور قربِ الٰہی کی طلب)

استعاذہ کی ایک حکمت انسان کے باطنی کمالات کے حصول سے متعلق ہے۔ شیطان دوری پر اور رجیم ملامت وشقاوت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا استعاذہ کے ذریعے انسان کو خدا سے دوری اور شقاوت سے توبہ کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں باہم لازم وملزوم ہیں۔ کیونکہ خدا سے دوری شقاوت کا سبب ہے اور شقاوت خدا سے دوری کا۔ خدا سے دوری قربِ الٰہی کے منافی ہے۔ اور شقاوت سعادت کے۔ کیونکہ تمام تر روحانی کمال قربِ الٰہی اور سعادت پر منحصر ہے۔ اس لئے انسان کو یہ تعلیم کی گئی ہے کہ وہ خدا سے بُعد اور شقاوت دونوں سے پناہ مانگے کہ جب اسے دوری سے نجات ملے گی تو قرب از خود میسر آجائے گا اور شقاوت سے نجات ملے گی تو سعادت از خود نصیب ہو جائے گی۔ اس میں ایک اور لطیف نکتہ قابل غور ہے کہ براہ راست قرب وسعادت مانگنے کی بجائے دوری اور شقاوت سے پناہ مانگنے میں ادب اور اظہارِ تذلل زیادہ ہے اور یہی مقصود

روحانیت ہے۔

پانچویں حکمت (انسان اپنی بے بسی کا اعتراف کرے)

استعاذہ کی علمی حکمت یہ ہے کہ انسان کو اپنے عجز و بے بسی کا علم ہو جائے، وہ یہ سمجھ لے کہ میں دینی و دنیوی منافع کے حصول اور بچاؤ پر خود قادر نہیں ہوں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان شامل حال نہ ہو اس وقت تک میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ احساس اور علم و شعور ہے جو انسان کو صحیح عظمت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اگر اس کا فقدان ہو اور انسان خود کو قادر مطلق اور غنی و بے نیاز سمجھ لے تو اس سے غرور و تکبر اور نخوت و فرعونیت جنم لیتی ہے، جو انسان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو غارت کر کے اسے دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیتی ہے آداب و شرائط عظمت کا یہی سنگ بنیاد ہے کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کے باوجود خود کو عاجز سمجھے اور انہیں بروئے کار لاتے ہوئے بھی صحیح نتائج کے لحاظ سے رب العالمین کی رحمت اور عطا و شفقت کا طلب گار رہے۔ حکم استعاذہ کا فلسفہ یہی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کفر و طاغوت، فتنہ و شر اور شیطنت کی تمام قوتوں کے خلاف برسر پیکار رہتے ہوئے یہ خیال ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں آنا چاہیئے کہ میں خود کو محض اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر شیطانی شر سے محفوظ اور ان باطل قوتوں کو زیر کر سکتا ہوں، یہی احساس عجز اسے کامیابی کے لئے مزید مضبوط ہونے کا محرک (Incentive) بھی فراہم کرے گا۔ اعوذ باللہ کے الفاظ خود ہی صراحت کے ساتھ انسان کے محتاج ہونے اور اللہ تعالیٰ کے غنی و بے نیاز ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔

چھٹی حکمت (تواضع اور انکساری)

مفسرین نے اس کی شہادت قرآن حکیم کے اس حکم سے دی ہے۔ جب حضرت انسان میں خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ذہن میں اس احساس کے جاگزیں ہو جانے کے بعد دل میں تواضع، انکساری اور تذلل و تضرع کی نعمت سے بہرہ ور کر دیتی ہے۔ یہی حالت فی الحقیقت جوہر عبادت اور ایمان ہے۔ انسان کو اگر یہ احساس اور قلبی حالت نصیب ہو جائے تو نہ اس سے ظلم و ستم ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی حق تلفی۔ گویا استعاذہ کا جوہر اصلی یہ ہے کہ انسان کبر و نخوت اور غرور و تمکنت سے پاک عالی صفت، منکسر المزاج اور متواضع انساں بن جائے اور ہر معاملے میں اپنے دل کا رشتہ امید صرف خدائے بزرگ و برتر سے وابستہ رکھے۔

ساتویں حکمت (توکل و یقین)

استعاذہ کا عملی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے عجز و انکساری کے اعتراف اور خشوع و خضوع کے حصول کے بعد بارگاہ ایزدی کی طرف کمال یقین کے ساتھ متوجہ ہو اور اس سے استمداد کرے

اور پھر اس کے لطف واحسان اور جود وسخا پر پورا توکل رکھے۔ اسے ہر فتنہ وشر اور خوف وغم سے پناہ بھی ملے گی اور دیگر انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔ خدا سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جان لے کہ مجھے کسی کا شر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب اس کے دل سے دنیا کا خوف وخطر نکل جائے تو وہ کسی بھی طاغوتی قوت اور باطل طاقت کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اسی فکر وعمل کو توحید کہتے ہیں۔

ہر کہ رمز لا اللہ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دین است

آٹھویں حکمت (ہر باطل کے ساتھ سازگاری سے پرہیز)

استعاذہ کی ایک حکمت یہ ہے کہ انسان خود کو کبھی بھی کسی شیطانی، طاغوتی اور باطل قوت کے ساتھ سازگاری کے لئے تیار نہ کر سکے۔ جب اس کی دعا یہی ہو کہ اے اللہ! میں ہر باطل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عارضی و مادی منافع اور مصالح کی خاطر خدا کو چھوڑ کر کذب وباطل سے سازگاری پیدا کرے۔ یہ تعلیم عین روح اسلام بلکہ فلسفہ توحید ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْآ اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ○
(محمد، ۴۷: ۳۵)

(پس تم ہمت نہ ہارو اور صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے جدوجہد) بے نتیجہ نہ جانے دے گا○

جب نبی اکرم ﷺ منیٰ میں مدینہ سے آئے ہوئے وفد سے بیعت اسلام لے رہے تھے تو اس بیعت اسلام کا مقصد عباس بن عبادہ انصاریؓ نے بڑے واشگاف لفظوں میں بیان کیا۔

انکم تبایعونه علی حرب الاسود والاحمر من الناس
(سیرت ابن ہشام: ۲:۴۴۶)

بے شک تم پیغمبر انقلاب ﷺ کے دست اقدس پر انسانوں میں سے ہر سیاہ وسفید کی بیعت کر رہے ہو۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

استعاذہ کا فلسفہ یہی ہے کہ خدا کی پناہ میں آ کر دنیا میں ہر باطل اور کفر وطاغوت کے خلاف علم جہاد بلند کیا جائے۔ شیطنت سے خدا کی پناہ طلب کر کے پھر اپنی عملی زندگی میں کذب ودجل، ظلم وجبر، کفر وعصیاں اور شیطنت کے دیگر مظاہر سے سازگاری پیدا کرنا اور ان کی حمایت کرنا صریح منافقت اور مذہب سے دھوکہ اور فریب ہے۔ اسی وجہ سے قرآن ہر شیطانی قوت کے ساتھ

غیر مصالحانہ مخاصمت کی تلقین کرتا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا۔

بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔

(فاطر، ۳۵:۶)

وجوہ تقدیم

یہاں ایک اور سوال ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے کہ استعاذہ کا حکم بطور خاص تلاوت قرآن سے پہلے کیوں ہے؟

حالانکہ قرآن خود کلام الٰہی اور سراسر ہدایت ہے۔اسی سے تمام گمراہی وضلالت کے پردے چاک ہوتے ہیں۔تو اس قدر کافی ووافی کتاب کی تلاوت پر استعاذہ کیوں مقدم ہے؟ یہی نکتہ غور طلب ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِO

سو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود (کی وسوسہ اندازیوں) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔

(النحل، ۱۶:۹۸)

پہلی وجہ (مطالعہ قرآن اور تدبر قرآن کی راہ میں شیطانی حملے سے بچاؤ)

اس حکم سے یہ اشارہ بڑی صراحت کے ساتھ ملتا ہے کہ شیطانی گمراہی کا اندیشہ اس راستے پر بھی ہے۔اس لئے یہاں احتیاط کا دامن تھامنے کی تلقین کی جاری ہی ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ضرور بالضرور شیطان مردود کی حیلہ سازیوں اور گمراہیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرلو کیونکہ اس راستے پر شیطان کا حملہ تمام حملوں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوگا۔سورۃ الاعراف میں اس امر کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَO

اس (ابلیس) نے کہا پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افراد بنی آدم کو گمراہ کرنے) کے لے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا (تا آنکہ انہیں راہ حق سے ہٹا دوں)o

(الاعراف، ۷:۱۶)

یہاں یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہوجاتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی گمراہ ہیں۔اور راہ حق کے متلاشی نہیں ہیں یا غلط عقائد واعمال کے راستوں پر چل رہے ہیں۔انہیں بہکانے کی زیادہ فکر شیطان کو نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو پہلے سے ہی اس کے ساتھی ہیں۔انہیں صرف اسی قدر دھوکے کی

ضرورت ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے رہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی صحیح ہے۔شیطان اپنی تمام تر قوت اور حیلہ سازی صراط مستقیم پر گامزن افراد کو بھٹکانے کے لئے صرف کرتا ہے' اس کی ساری محاذ آرائی ہی دراصل ان لوگوں کے خلاف ہے جو راہ ہدایت پر چل رہے ہیں اور راہ ہدایت بلاشبہ قرآن وسنت کی راہ ہے۔ جو لوگ قرآن وسنت سے اپنے فکر کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں اور انہیں سے اپنے خیالات ونظریات کو اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ شیطان انہیں گمراہ کرنے کے لئے اسی سیدھی راہ پر تاک لگائے بیٹھا ہے۔جیسا کہ **لا قعدن لهم صراطک المستقیم** (میں یقیناً تیرے سیدھے راستے پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا) میں اس امر کی صراحت ہے۔ اگر وہ قرآن وسنت سے تمسک واعتصام کی آرزو رکھنے والوں کو گمراہ کرلے تو یہی اس کی کامیابی ہے۔ دوسروں کو گمراہ کر لینا اس کے لئے چنداں باعث فخر نہیں' اس راستے سے گمراہی اس طرح داخل ہوسکتی ہے کہ قرآن پڑھنے والا جس معنی ومفہوم کو قرآنی مدعا سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت قرآنی مدعا نہ ہو' بلکہ اس کی عقل کا بہکاوا ہو وہ اسی کو فکر قرآنی سمجھ کر اپنے نقطہ نظر میں پختہ رہے اور اسے اس تحریف معنوی کا شعور تک نہ ہو۔اس طرح وہ خود کو ہدایت یافتہ اور دوسروں کو گمراہ تصور کرتا رہے' حالانکہ یہ اس کی اپنی گمراہی ہو۔اسی بات کو قرآن اپنے لفظوں میں بھی بیان کرتا ہے۔سورہ البقرہ میں ایک تمثیل بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَO

(البقرہ'۲:۲۶)

(اس طرح) اللہ ایک ہی بات کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس سے صرف انہی کو گمراہی میں ڈالتا ہے جو (پہلے ہی) نافرمان ہیں۔

چنانچہ تلاوت قرآن سے قبل شیطانی حملہ سے بچاؤ کی ضرورت عام حالات سے بھی زیادہ تھی۔اس لئے اس موقع پر بالالتزام استعاذہ کا حکم صادر کیا گیا۔تا کہ راہ ہدایت پر چلتے ہوئے گمراہی کے تمام خدشات سے محفوظ ومامون ہوا جاسکے۔چور ہمیشہ اسی پر حملہ آور ہوگا جس کے پاس کچھ دولت ہوگی۔اگر کوئی پہلے سے ہی تہی دامن ہو تو اس پر چور کو زیادہ تحریص نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے حکم استعاذہ قرآن پڑھنے پر مقدم ہے تا کہ شیطانی حملہ اور اس کے خطرناک اثرات سے حفاظت کا سامان پہلے تیار کرلیا جائے اور پھر انسان دشت تحقیق کا رہ نورد ہو۔اس لئے ضروری ہے کہ قرآن پر بات کرتے ہوئے احادیث رسول ﷺ آثار صحابہ وتابعین اور اکابر امت سے بھی تائید واستشہاد حاصل کرلیا جائے کیونکہ وہ **الا عبادک منهم المخلصین** (سوائے تیرے ان بندوں کے جو چنے ہوئے ہیں) کے تحت شیطانی گمراہی سے محفوظ ومامون ہوتے ہیں ورنہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من قال فی القران بغیر علم فلیتبوا مقعده من النارO

جس شخص نے قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کی پس وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔

(جامع ترمذی، کتاب التفسیر، ح: ۲۹۵۰)

ایک اور روایت میں حضورﷺ نے ارشاد فرمایا۔

و من قال فی القران برایه فلیتبوا مقعده من النار

جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے یا نہ جانتے ہوئے گفتگو کی پس وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

(جامع ترمذی، کتاب التفسیر، ح: ۲۹۵۱)

اسی طرح حضورﷺ نے فرمایا۔

من قال فی القران برایه فاصاب فقد اخطا

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کی اس نے خطا کی۔

(جامع ترمذی، کتاب التفسیر، ح: ۲۹۵۲)

چنانچہ آج ہر شخص تفسیر قرآن کی ضروریات ولوازمات پورے کئے بغیر تفسیر قرآن کی جسارت کررہا ہے اور اپنے اپنے ناقص فہم سے قرآنی فکر کی تحریف کررہا ہے۔اس لئے اس راستے پر پہلے سے کہیں زیادہ گمراہی کے خدشات پیدا ہو گئے ہیں۔

دوسری وجہ (قرآن اطاعت الٰہی ہے)

استعاذہ کی دوسری وجہ تقدیم یہ ہے کہ قرآن اطاعت الٰہی کا راستہ ہے اور تعوذ شیطنت سے نجات کا ذریعہ۔شیطنت سے نجات حاصل کئے بغیر انسان اطاعت الٰہی کے فوائد وثاثیرات سے متمتع نہیں ہوسکتا۔اس لئے حکم دیا گیا کہ قرآن پڑھنے سے پہلے خود کو شیطنت کے غلبہ ونفوذ سے پاک کرلیا جائے۔تاکہ قرآن کی جملہ برکات وثمرات کے قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ تلاوت قرآن پر استعاذہ کو اسی طرح مقدم رکھا گیا ہے جس طرح تعلیم کتاب وحکمت پر تزکیہ نفوس کو تاکہ قلب وباطن انوار معارف قرآن کے اہل ہو جائیں تو تعلیم کتاب وحکمت کا صحیح فیضان حاصل ہوسکتا ہے۔ارشاد باری ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

(آل عمران، ۳: ۱۶۴)

تیسری وجہ (قلب وروح کی تطہیر)

استعاذہ کو تسمیہ سے پہلے پڑھنے کا حکم ہے۔حالانکہ اسلام میں ہر کام کا آغاز تسمیہ سے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تسمیہ ذکر الٰہی اور حصہ قرآن ہے۔اس لئے اس کا

درجہ تحلیہ (آرائش) کا ہے۔ جب کہ استعاذہ بمنزل تخلیہ (خلوت) کے ہے اور تخلیہ ہمیشہ تحلیہ پر مقدم ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص لباس فاخرہ پہننا چاہے تو وہ پہلے بدن کو میل کچیل سے پاک کرنے کے لئے غسل کرتا ہے۔ اسی طرح ذکر الٰہی اور اس کے انوار و تجلیات کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ باطنی آلائشوں اور روحانی نجاستوں سے روح کو بالکل پاک کر لیا جائے جو صرف استعاذہ سے ہی ممکن ہے۔ قرآن کے ظاہری مس کے لئے بھی طہارت جسمانی ضروری ہے۔ جیسا کہ حکم الٰہی ہے۔

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَO قرآن کو مس نہ کریں سوائے باوضو لوگوں کے O
(الواقعہ ۵۶:۷۹)

یہ امر آداب تلاوت میں سے ہے۔ اسی طرح استعاذہ بھی روحانی طہارت کا واحد کامل طریقہ ہے۔ جس کے بعد ہی قرآنی ہدایت کے اخذ و حصول کی اہلیت پیدا ہو سکتی ہے۔

چوتھی وجہ (شیطنت سے بچاؤ تاکہ حصول رحمت کا اہل ہو)

استعاذہ کو تسمیہ پر مقدم کرنے میں لفظی و معنوی مناسبت بھی ہے۔ استعاذہ میں ''الشیطان الرجیم'' سے پناہ طلب کی گئی ہے اور تسمیہ میں ''الرحمٰن الرحیم'' سے تعلق و اتصال کا بیان ہے۔ استعاذہ کے الفاظ میں خدا کی رحمت سے دوری' شقاوت و بدبختی اور محرومی کا ذکر ہے اور ان اوصاف سے نجات پانے کی تمنا کا بیان ہے۔ ادھر اس کے بعد متصلاً تسمیہ کے الفاظ میں خدا کی رحمانیت و رحیمیت کا تذکرہ ہے۔ جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اے انسان تو اپنا دامن گناہوں اور کوتاہیوں سے بچانے کی تمنا تو کر' خدا کا دامن رحمت تجھے اپنی پناہ میں لے لے گا۔ جس کے بعد تیری دوری قرب سے' تیری شقاوت سعادت سے' اور تیری محرومی لطف و عنایت سے بدل جائے گی تو خدائے رحمٰن و رحیم کی حفاظت میں آجائے گا اور اس طرح تجھے دنیا کی کوئی طاقت خیر سے محروم نہ کر سکے گی۔

ارکان استعاذہ

امام فخر الدین رازیؒ ''تفسیر کبیر'' میں لکھتے ہیں کہ اس کلام کے پانچ ارکان ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ **الاستعاذہ** ۔ اس سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کے ذریعے بارگہ ایزدی میں تعوذ کیا جاتا ہے یعنی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

۲۔ **المستعیذ**۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو استعاذہ کرتا ہے یعنی بارگاہ الوہیت میں پناہ کا طلب گار ہوتا ہے وہ اعوذ کا فاعل ہے۔

۳۔ **المستعاذ به**۔اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔جس کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ان کلمات میں لفظ ''اللہ''''اعوذ'' کا مفعول بہ ہے۔

۴۔ **المستعاذ منه**۔اس سے مراد شیطان رجیم ہے جس سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

۵۔ **اجل الاستعاذه**۔اس سے مراد استعاذہ کی حکمت اور غرض و غایت ہے۔جس کی خاطر خدا کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔یعنی شیطان کا وہ خاص شر جس سے محفوظ و مامون ہونے کے لئے استعاذہ کیا جاتا ہے۔

استعاذہ اور تسمیہ کا باہمی تعلق

استعاذہ کا معنی و مفہوم اور اس کا فلسفہ و حکمت سمجھ لینے کے بعد یہ امر بدیہی طور پر سامنے آجاتا ہے کہ انسان نے چونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نیازمندی کے ساتھ سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنی بے بسی و بے کسی اور عاجزی و ناتوانی کا اعتراف کرلیا ہے۔شیطانی خصائل و رذائل طاغوتی فتن و شر اور ابلیس لعین کے بہکاووں سے پناہ مانگ لی ہے۔اس لئے اب اسے ذات الوہیت کی بے پایاں رحمتوں اور عنایتوں کا مژدہ جانفزا سنا دیا جانا چاہئے۔اب تو شیطان رجیم سے پناہ مانگنے والے کو رحمٰن و رحیم کا سایہ عاطفت میسر آہی جانا چاہیئے۔جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ اصل مدعا تو تسمیہ الٰہی کا لباس فاخرہ پہننا تھا۔لیکن اس سے قبل ضروری تھا کہ انسان اپنے قلب و باطن کو روحانی آلائشوں سے پاک کرنے کے لئے غسل استعاذہ کرلے۔کیونکہ طہارت کاملہ کے بغیر انسان باری تعالیٰ کے سرچشمہ الوہیت' سرچشمہ رحمانیت اور سرچشمہ رحیمیت سے فیض یاب نہیں ہوسکتا تھا۔

مستزاد یہ کہ بغرض تلاوت **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کا پڑھنا گویا علوم قرآنی کے بحر بے کنار میں غوطہ زن ہونا تھا۔ملاح تیراکی سے پہلے ڈوبنے سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرلیا کرتے ہیں۔چنانچہ بسم اللہ سے قبل استعاذہ کی تعلیم اس لئے دی گئی کہ انسان شیطان کے گمراہ کن حملوں سے بچنے کے لئے ذات حق کی پناہ طلب کرلے تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ''یھدی بہ کثیرا'' کے زمرے میں شامل ہوسکے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ''یضل بہ کثیرا'' کے فریب آفریں بھنور میں پھنس کر گم گشتہ راہ ہوجائے۔اس لحاظ سے بیان استعاذہ کی حیثیت درحقیقت مضمون تسمیہ کی ضروری تمہید' حصول ہدایت کی محفوظ سبیل اور احتمال گمراہی کی حفاظتی تدبیر کی تھی سو وہ پہلے ہوچکی۔اب اصل مضمون تسمیہ کا آغاز کیا جاتا ہے۔اگر استعاذہ اور تسمیہ کے تعلق کو ملخصاً سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں کہا جائے گا کہ:

۱۔ استعاذہ میں عقائد باطلہ اور اعمال سیہ سے پرہیز تھی۔بسم اللہ میں عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی طرف رجوع ہے۔

۲۔ استعاذہ میں ماسوی سے لاتعلقی اور علیحدگی کا اعلان تھا' بسم اللہ میں توجہ الی اللہ کا باقاعدہ

اقدام ہے۔

۳۔ استعاذہ میں ہر قسم کے شر سے حفاظت طلب کی گئی تھی۔ بسم اللہ میں انعامات وعنایات ایزدی کا سوال کیا جارہا ہے۔

۴۔ استعاذہ کے ذریعے باطنی طہارت اور روحانی بالیدگی حاصل کی گئی تھی، بسم اللہ کے ذریعے قرآنی انوار وتجلیات کے نزول کا آغاز ہورہا ہے۔

۵۔ استعاذہ گمراہی سے بچاؤ تھا۔ بسم اللہ ہدایت کا حصول ہے۔

۶۔ استعاذہ عزم سفر تھا، بسم اللہ حصول منزل ہے۔

۷۔ استعاذہ مریض کے لئے مجوزہ پرہیز تھا۔ بسم اللہ اس کا مجوزہ علاج ہے۔

۸۔ استعاذہ رذائل اخلاق اور خصائص ذمیمہ سے نجات حاصل کرنا تھا۔ بسم اللہ خود کو اوصاف واخلاق الٰہیہ سے متصف کرنا ہے۔

۹۔ استعاذہ بغض وعناد سے برات کا نام تھا۔ بسم اللہ پیکر رحمت ورافت قرار پانے کا نام ہے۔

۱۰۔ استعاذہ خدا کی دوری سے پناہ مانگنے کا نام تھا۔ بسم اللہ اس کے قرب ووصال کی طلب کا نام ہے۔

۱۱۔ استعاذہ اپنی عاجزی کا اعتراف تھا۔ بسم اللہ خدا کی قدرت کا اعتراف ہے۔

۱۲۔ استعاذہ کا آغاز نفس امارہ کے شعور اور اس کی مذمت سے ہوا تھا، بسم اللہ کا آغاز ''نفس لوامہ وملہمہ'' کے شعور اور ان کی تحسین سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ استعاذہ کا ثمرہ ونتیجہ ''نفس مطمئنہ'' تھا۔ بسم اللہ کا ثمرہ ''نفس راضیہ ومرضیہ'' ہے جو فی الحقیقت ''نفس کاملہ'' قرار پاتا ہے۔

۱۴۔ استعاذہ میں شخصیت کی اصلاح تھی بسم اللہ میں اس کا منتہائے کمال ہے۔

اسی تعلق کی بنا پر ہم نے تفسیر تسمیہ کا آغاز حکمت استعاذہ کے بیان سے کیا ہے۔ اب ہم تسمیہ کے مفہوم اور فلسفہ کی نسبت چند کلمات عرض کرتے ہیں۔

www.MinhajBooks.com

باب ۲

فلسفہ تسمیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمَانِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے (مدد و برکت طلب کرتے اور اس کی معیت پر بھروسہ کرتے ہوئے) شروع جو غایت درجہ مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

O

www.MinhajBooks.com

www.MinhajBooks.com

تسمیہ کی ترکیب نحوی اور ایک لطیف نکتہ

یہ حصہ عام قارئین کی بجائے زیادہ تر مدارس دینیہ کے طلباء اور عربی خواندہ طبقے کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ''حرف باء'' جار ہے ''اسم'' مجرور اور مضاف 'لفظ ''اللہ'' مضاف الیہ اور موصوف ہے' لفظ ''الرحمان الرحیم'' دونوں یکے بعد دیگرے موصوف یعنی اللہ کی صفات ہیں۔ موصوف (اللہ) اپنی دونوں صفات (الرحمان الرحیم) کے ساتھ مل کر اسم کا مضاف الیہ بن گیا اور مضاف (اسم) اپنے مضاف الیہ (اللہ الرحمن الرحیم) سے مل کر جار یعنی ''حرف باء'' کا مجرور ہوگیا۔ اب اس حرف باء (جار) کا ایک متعلق ہے جو فعل محذوف ہے۔ وہ یہاں اشرع' ابدا یا اقراء وغیرہ ہوسکتا ہے۔۔ چنانچہ ''جار ومجرور'' اور ''فعل محذوف''، جس میں فاعل بھی ہے۔ سب مل کر ''جملہ فعلیہ خبریہ'' پر منتج ہوگئے۔ اس کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ یہاں فعل محذوف صیغہ امر ابدا' یا اقراء کو مانا جائے' اس طرح تسمیہ' ''جملہ فعلیہ انشائیہ'' قرار پائے گا۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل غور ہے کہ تسمیہ کا ''جملہ فعلیہ خبریہ'' یا ''جملہ فعلیہ انشائیہ'' ہونا فعل محذوف کی نوعیت پر مبنی تھا۔ اگر فعل محذوف کی بجائے زیادہ توجہ حرف با کے مفہوم اور اس کی نوعیت کے تعین پر کی جائے' جیسے کہ بعد میں بیان کیا جائے گا تو تسمیہ کا کلام ہر صورت میں ''دعائیہ'' قرار پا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں حرف با تین حالتوں میں سے یقیناً کسی نہ کسی ایک حالت کا حامل ہے اور وہ ہیں ''الصاق ومصاحبت'' ''استمداد واستعانت'' اور ''تبرک وتیمن'' لہٰذا ''باء'' مذکورہ بالا میں سے جس حالت پر بھی دلالت کرے۔ کلام تسمیہ ایک ''دعا'' بن جاتی ہے اور یہی مقصود الٰہی ہے۔

www.MinhajBooks.com

تسمیہ کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمان الرحیم کے الفاظ کو اصطلاح میں ''تسمیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہی تسمیہ ایک آیت کے حصے کے طور پر قرآن حکیم کی سورہ النمل میں وارد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بالاتفاق حصہ قرآن بھی ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّہٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِO (النمل، ۲۷:۳۰)

(خط) سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور بے شک وہ اللہ کے نام سے ہے جو نہایت مہربان، رحم کرنے والا ہےO

ائمہ فقہ میں سے شوافع اسے سورہ الفاتحہ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض علماء ہر سورت سے پہلے بسم اللہ کے وارد ہونے کی بنا پر سوائے سورہ براءت کے، اسے ہر سورت کا جزو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر، حضرت علی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، مکحول اور زہری رضی اللہ عنہم وغیرہم کے اسماء بیان کئے جاتے ہیں۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک قول اسی طرح منقول ہے۔ قول معروف اور مذہب مختار یہ ہے کہ ''بسم اللہ'' قرآن کا حصہ ہے۔ لیکن سورہ الفاتحہ یا دوسری سورتوں کا جزو نہیں بلکہ ہر سورت سے پہلے اسے محض امتیاز وانفصال اور تیمن وتبرک کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہے۔

کان المسلمون لا یعلمون انقضاء (روایة) کان السورة) حتی تنزل ''بسم الله الرحمن الرحیم'' فاذا نزلت عرفوا ان السورة قد انقضت (و فی روایة) ان السورة قدختمت و استقبلت او ابتدات سورة اخری

(ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء من جھر بھا ۱:۱۲۲)(البیھقی فی السنن، ۲:۴۳)

مسلمانوں کو دو سورتوں کے درمیان فرق وانفصال کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نازل ہونے سے ایسی حد فاصل قائم ہوئی کہ لوگوں کو اس کے ذریعے ہر ایک سورت کے شروع ہونے یا ختم ہونے اور دوسری کے شروع ہونے کی معرفت حاصل ہوگئی۔

مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء وفقہاء بھی اسی قول کے موید ہیں کہ ''بسم اللہ'' ''سورہ النمل'' میں وارد ہونے کے اعتبار سے ایک مرتبہ تو قرآن کی مستقل آیت ہے۔ لیکن باقی تمام سورتوں سے پہلے اس کا ورود محض علامت فصل کے طور پر ہے تا کہ اس کے ذریعے دو متصل سورتوں کے درمیان واضح فرق کا پتہ چل جائے۔ امام ابوحنیفہؒ امام مالک، امام سفیان ثوریؒ امام احمد بن حنبلؒ امام اوزاعیؒ وغیرہم کا مذہب بھی یہی ہے۔

نماز میں قرأت تسمیہ کا حکم

تسمیہ کی شرعی حیثیت کے تحت تسمیہ کا سورہ فاتحہ کا حصہ نہ ہونا اس امر سے بھی مترشح ہوتا

ہے کہ آنحضرت ﷺ جہری نمازوں میں قرات بالجہر کا آغاز "**الحمد لله رب العالمین**" سے کرتے تھے۔ "بسم اللہ کی قراءت جہرا" نہ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

حضرت انس ؓ سے مروی ہے۔

ان النبی ﷺ و ابابکر ؓ و عمر ؓ کانوا یفتتحون الصلوة بالحمد لله رب العالمین

بخاری اور مسلم دونوں میں روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکر ؓ اور عمر ؓ جہری نماز کا آغاز الحمدللہ سے فرمایا کرتے تھے۔

التکبیر '۱: ۱۰۳)

و زاد مسلم ولایذکرون بسم الله الرحمن الرحیم فی اول قراة ولا فی اخرھا

صحیح مسلم کے مزید الفاظ یہ ہیں کہ پہلی اور (جہراً) بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

بالبسملہ '۱: ۱۷۲)

سعید بن منصور سنن میں ابووائل ؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

کانوا یسرون التعوذ والبسملة فی الصلوة

صحابہ کرام ؓ نماز میں تعوذ اور تسمیہ آہستہ پڑھتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اسناد صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

قال صلیت خلف رسول الله ﷺ وابی بکر و عمر و عثمان رضی الله عنهم فلم اسمع احدا منهم یقرء بسم الله الرحمن الرحیم

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی جہرا بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب حجۃ من قال لا یجھر بالبسملۃ '۱: ۱۷۲)

آنحضرت ﷺ مکی دور میں ابتدا دوران نماز بسم اللہ جہرا پڑھتے تھے۔ اس پر مشرکین مکہ استہزا کرتے کیونکہ وہ "مسیلمہ کذاب" کو رحمٰن کہتے تھے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سن کر وہ طعنہ دیتے کہ محمد ﷺ اہل یمامہ کے معبود یعنی "مسیلمہ کذاب" کی طرف بلاتے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے صحابہ ؓ کو بسم اللہ کی قرات آہستہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

فامر رسول اللہ ﷺ باخفائها فما جهر بها حتی مات
(الدر المنثور ١:١١)

لہٰذا حضور ﷺ نے حکم صادر فرما دیا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوشیدہ پڑھا کرو پھر تا وقت وفات کبھی نماز میں بسم اللہ پکار کر نہیں پڑھی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

فلما نزلت هذه الاية امر رسول الله ﷺ ان لا يجهر بها
(طبرانی فی معجم الکبیر ١١:٣٤٨)

جب آیت بسم اللہ نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بسم اللہ بلند آواز سے نہ پڑھی جائے۔

اسی طرح صحیح بخاری، صحیح مسلم اور طبرانی کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہؒ ترمذیؒ ابوداوٴدؒ نسائیؒ ابن ماجہؒ ابن خزیمہ اور بیہقی وغیرہ متعدد کتب حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ تسمیہ کی قراءت ''سورہ فاتحہ'' یا کسی اور سورت کے حصے کے طور پر نہیں بلکہ الگ حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اگر یہ حصہ ''سورہ فاتحہ'' کا حصہ ہوتی تو یقیناً اس کی قرات بھی اس کے ساتھ بلند آواز سے کی جاتی۔ جن روایات میں بسم اللہ کی قرات کا دوران نماز بلند آواز سے ہونا مذکور ہے وہ مکی دور کے اوائل ایام سے متعلق ہیں۔ لیکن بعد میں صراحت کے ساتھ حضور ﷺ نے پکار کر پڑھنے کی ممانعت فرما دی۔ لہٰذا تسمیہ کا نماز میں پڑھا جانا تلاوت قرآن کے آغاز وافتتاح کے طور پر ہے۔ کیونکہ حمد وثنا کے بعد جب سورۃ فاتحہ کی قرات شروع ہوتی ہے تو یہی دوران نماز تلاوت قران کا آغاز ہے اور یہاں بھی یہ حکم ہے کہ تلاوت قرآن کا آغاز پہلے تعوذ اور پھر تسمیہ سے کیا جائے۔

تسمیہ سے ہر کام کے آغاز کا حکم (تاریخی پس منظر)

شریعت اسلامیہ میں ہمیشہ سے یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ ہر جائز اور مشروع کام کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے۔

١۔ جب نوح علیہ السلام نے طوفان سے بچاوٴ کے لئے اذن الٰہی کے مطابق کشتی تیار کر لی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں سوار کر لیا تو کشتی چلانے سے قبل فرمایا۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O
(ہود ١١:٤١)

اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاوٴ اللہ ہی کے نام سے اسکا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

٢۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ صبا کو جو تبلیغی خط لکھا۔ اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا گیا تھا۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمَانَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِO

(النمل ۲۷:۳۰)

۳۔ عہد عیسوی میں بھی ان مبارک کلمات کی برکات وتاثیرات کا پتہ چلتا ہے۔ اسرائیلیات میں ایک روایت مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قبر پر گزر ہوا۔ آپ نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ صاحب قبر پر عذاب کر رہے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ گزر ہوا تو دیکھا کہ رحمت کے فرشتے نور کے طبق اس پر پیش کر رہے ہیں۔ آپ کو بہت تعجب ہوا نماز پڑھی اور کشف حال کے لئے دعا کی۔

فاوحی الله تعالی الیه یا عیسی کان هذا العبد عاصیا و مذمات کان محبوسا فی عذابی و کان قدترک امراة حبلی فولدت ولدا و ربته حتی کبر فسلمته الی المعلم فلقنه المعلم بسم الله الرحمن الرحیم فاستحییت من عبدی ان اعذبه بناری فی بطن الارض و ولده یذکر اسمی علی وجه الارض

(تفسیر کبیر ۱:۱۷۲)

عیسیٰ! یہ بندہ اپنی موت کے دن سے میرے عذاب میں گرفتار تھا۔ وقت مرگ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ جس نے بعد میں ایک بچہ پیدا کیا۔ اس کی ماں نے اسے پالا اور معلم دین کے سپرد کر دیا۔ اس معلم نے جب اس بچے کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھائی تو ہم کو شرم آ گئی کہ اس کا باپ قبر میں عذاب میں مبتلا رہے اور اس کا بیٹا زمین پر ہمارے نام کا ذکر کرے پس ہم نے اس کو بخش دیا۔

۴۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بھی ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ یہ حکم بعض معاملات میں ''واجب'' کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض میں ''سنت'' کا اور بعض میں ''مستحب'' کا قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا۔

فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ۔

(الانعام ۶:۱۱۸)

سو تم اس (ذبیحہ) سے کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

اس سے آگے مزید حکم دیا گیا۔

وَمَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ۔

(الانعام ۶:۱۱۹)

اور تمہیں کیا ہے کہ تم اس (ذبیحہ) سے نہیں کھاتے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہے (تم ان حلال جانوروں کو بلاوجہ حرام ٹھہراتے ہو)۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

كل امر ذی بال لايبدا فيه بسم الله الرحمن الرحيم اقطع

(الدر المنثور ۱: ۱۰)

جو کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ ناقص رہتا ہے۔ یعنی اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

اس حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھیں جیسے حضور ﷺ نے فرمایا۔

لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه

(الوضوٴ: ۱۵)

اس شخص کا وضو نہیں جس نے اس پر بسم اللہ نہ پڑھی۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بسم اللہ کے نہ پڑھنے سے وضو کی فرضیت ہی ناقص رہ جاتی ہے بلکہ فرض تو ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن سنن و مستحبات کی شمولیت سے جو کمال نصیب ہوتا ہے اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ فعل جو بغیر بسم اللہ کے شروع کیا جائے، ممکن ہے دنیوی لحاظ سے مطلوبہ نتائج کے حصول میں تو ناکام نہ ہو لیکن اپنے اجر و ثواب کے اعتبار سے عند اللہ کامل نہ ہوگا۔ اسی روحانی کمال اور نقص کی طرف متذکرہ بالا حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ کلام الٰہی جو سراسر خیر و برکت ہے۔ جب اس کے پڑھنے سے بھی پہلے بسم اللہ کا پڑھنا بطور شرط لازم ہے تو دیگر امور حیات سے قبل تسمیہ کا پڑھا جانا کس قدر ضروری ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کی اپنی عملی مداومت بھی اسی اصول پر تھی۔

۵۔ یہاں تک کہ باری تعالیٰ نے خود اپنے کلام مبارک کے نزول کے آغاز و افتتاح کے لئے جو کلمات منتخب فرمائے وہ بھی ''تسمیہ'' کی نوعیت کے تھے۔ غار حرا میں گونجنے والی سب سے پہلی قرآنی صدا یہ تھی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَo

(العلق ۹۶: ۱)

(اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیئے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایا۔

گویا آدابِ قرات میں سب سے پہلا قرینہ بسم اللہ سے شروع کرنا تھا اور اسی قرینہ کے مطابق نبی اکرم ﷺ سے قرات کا آغاز کرایا گیا۔ مفسرین عام طور پر بسم اللہ کو معنوی وسعت کے اعتبار سے تمام قرآنی علوم کی جامع قرار دیتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ اسی باب میں ایک قول نقل کرتے ہیں۔

www.MinhajBooks.com

کل العلوم مندرج فی الکتب الاربعة و علومھا فی القران و علوم القران فی الفاتحة و علوم الفاتحة الرحیم) و
علومھا فی الباء من بسم اللہ
(تفسیر کبیر، ۱:۹۹)

تمام علوم و معارف چار الہامی کتابوں میں درج کئے گئے ہیں اور ان کے تمام علوم قرآن میں اور قرآن کے تمام علوم سورۃ الفاتحہ میں اور سورۃ الفاتحہ کے تمام علوم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اور اس کے تمام علوم بائے بسم اللہ میں۔

چنانچہ تسمیہ کی ہمہ پہلو تفسیر اسی طرح ناممکن ہے جیسے پورے قرآن کی۔ تاہم یہاں اس کے چند گوشوں پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حذف فعل کی حکمت

قرآن میں تسمیہ کا بیان اس طرح ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جونہایت مہربان رحمت والا ہے۔ یہاں ایک خاص امر قابل توجہ ہے کہ قرآنی عبارت میں ''شروع کرتا ہوں'' کے لئے کوئی لفظ یا کلمہ استعمال نہیں ہوا۔ ترجمے میں یہ الفاظ معنوی طور پر از خود تصور کئے جاتے ہیں۔ درحقیقت قرآن کے اس انداز میں خاص حکمت پنہاں ہے۔

اگر قرآن ''شروع کرتا ہوں'' کے الفاظ اپنی عبارت میں استعمال کرتا تو اس کی صورت یہ ہوتی ابداء...... اشرع...... ابتدا (میں آغاز کرتا ہوں) ان میں ہر لفظ فعل اور فاعل دونوں کا جامع ہوتا۔ عام طور پر یہی عربی ادب کا اسلوب ہے کہ فعل اور فاعل اکٹھے ہوا کرتے ہیں۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ابداء وغیرہ کا لفظ بسم اللہ سے پہلے استعمال کیا جاتا۔

(۲) دوسری یہ کہ ایسا لفظ بسم اللہ کے بعد استعمال ہوتا لیکن قرآن نے اسے ہر صورت میں محذوف کر دیا۔

اس کی چند حکمتیں ہیں، ان حکمتوں کے بیان سے قبل یہ اصول ذہن نشین ہو جانا چاہئے کہ بعض اوقات عربی عبارت میں ایسے حروف استعمال ہوتے ہیں جن سے پہلے کوئی فعل محذوف تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کا شمار معنی میں تو ہوتا ہے لیکن عبارت میں نہیں مثلاً

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ۔
(البقرہ، ۲:۳۰)

اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔

یہاں قاعدہ نحو کے مطابق اذ سے پہلے ''اذکر'' فعل محذوف ہے جس کا معنی ہے (یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اسی طرح حرف باء جس سے تسمیہ کا آغاز ہو رہا ہے اس سے پہلے بھی ایک فعل محذوف ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فعل کو محذوف رکھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔

پہلی حکمت

اگر ابداء یا اس جیسا کوئی لفظ بسم اللہ سے پہلے وارد ہوتا تو یہ امر واضح تھا کہ اس کا فاعل وہ شخص خود ہی ہوتا جو قرآن کی تلاوت یا کسی دوسرے کام کا آغاز کر رہا تھا۔ ابداء کا فاعل اللہ تعالیٰ کسی لحاظ سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ باری تعالیٰ چونکہ تعلیم یہ دینا چاہتے تھے کہ قرآن کی تلاوت ہو یا کوئی اور جائز کام' اس کا آغاز اللہ کے نام سے ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس مخصوص ادب معاشرت کی تعلیم کلمات تسمیہ کے ذریعے دی جا رہی تھی۔ اس لئے یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ خود ان ہی کلمات کا آغاز اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے ذکر سے ہوتا۔ چنانچہ اس مخصوص ادب اور ضابطہ عمل کی تعلیم بھی اسی انداز سے دی گئی کہ اظہار مدعا کا آغاز بھی براہ راست اللہ ہی کے ذکر سے ہو کسی اور کے ذکر سے نہیں۔ کیونکہ اسی طرح کمال برکت کا حصول ممکن ہے۔

دوسری حکمت

صیغہ متکلم واحد کا استعمال ہوتا یا جمع کا' دونوں صورتوں میں قائل اپنا اور اپنے فعل کا ذکر اسم باری تعالیٰ پر مقدم کرتا۔ یہ امر ادب و احترام کی اعلیٰ منزلوں کے منافی تھا۔ یہ لحاظ عام گفتگو میں بھی رکھا جاتا ہے کہ اگر قائل کسی کام کے ضمن میں اپنے علاوہ دوسرے افراد کا ذکر بھی مشترکہ طور پر کرنا چاہتا ہو تو پہلے دوسروں کا نام لیا جاتا ہے اور آخر میں متکلم اپنا نام لیتا ہے کیونکہ یہ آداب تہذیب کلام کا حصہ ہیں۔ اپنا نام پہلے لینا معیار لطافت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کسی کام میں افضل پر مفضول کی سبقت بھی خلاف ادب تصور کی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن حکیم سے عرض کرتا ہوں کہ بعض لوگوں نے عہد رسالت میں عیدالاضحیٰ کے دن آنحضرت ﷺ سے پہلے قربانی کردی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللهِ وَ رَسُوْلِهِ وَاتَّقُوا اللهَ اِنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سنتا جانتا ہے○

(الحجرات'۴۹:۱)

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ ان کا عمل حکم الٰہی کی اطاعت پر مشتمل تھا اور وہ خون بھی محض رضائے الٰہی کی خاطر بہایا گیا تھا جو کہ خالصۃً عبادت تھا۔ لیکن ان سے خطا صرف یہ سرزد ہوئی کہ وہ عمل میں وقتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر تقدم کر بیٹھے تھے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کو رسالت مآب ﷺ کی تعظیم و ادب کے منافی معلوم ہوئی۔ انہیں قربانیاں پھر سے کرنے کا حکم صادر کیا گیا اور آئندہ کے لئے حکماً اس اقدام کے امکان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ بعض لوگ رمضان المبارک سے ایک دن قبل روزہ رکھنا شروع کر دیتے تھے اور اس طرح وہ

آنحضرت ﷺ پر تقدم کر بیٹھتے۔ چنانچہ اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکماً منع فرما دیا۔ اس مثال کے ذریعے درحقیقت یہ بات واضح کرنا مقصود تھی کہ بعض اوقات مقدم خلاف ادب تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ بسم اللہ میں جو کہ خود ہی سراسر ادب کی تعلیم ہے اسی اصول کو لفظاً بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تا کہ کلام میں بھی ادب الوہیت نظرانداز نہ ہو کہ کیونکہ یہی کمال ایمان کی علامت ہے۔ ادب سے محروم شخص علم و عمل کی بے پناہ دولتوں کے باوجود لذت ایمان سے محروم رہتا ہے۔ اسی لئے ادب ہر سطح پر جس قدر بھی ملحوظ رہے بہتر ہے۔ کلام میں اس قدر لفظی احتیاط اور حکمت و مصلحت انسانی کوشش کے باوجود پیش نظر نہیں رہ سکتی۔ یہ صرف کلام الٰہی کا اعجاز ہے جو بغیر تصنع کے ان حکمتوں پر دلالت کر رہا ہے۔

تیسری حکمت

یہ حکمتیں تو ابدا ُوغیرہ کے الفاظ بسم اللہ پر مقدم نہ کرنے میں مضمر تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نام سے پہلے کسی اور کا ذکر تو خلاف ادب تھا اس لئے اسے محذوف رکھا گیا مگر بعد میں بیان نہ کرنے میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ صاحب حکمت کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ ابداء یا اقراء ایسے الفاظ کسی نہ کسی کام کے کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ جب ابداء یا اشرع کی صورت میں کسی کام کے شروع کرنے کا ذکر آئے گا تو اس میں فاعل خود متکلم کی ذات ہوگی۔ گویا متکلم تسمیہ کے ذریعے کسی نہ کسی فعل میں اپنے فاعل ہونے کا ذکر بھی ساتھ ہی کر رہا ہوگا کہ ''اللہ کے نام سے میں (فلاں کام) شروع کرتا ہوں'' اس طرح فعل کی نسبت متکلم کی طرف ہو جاتی ہے اور اس کا فاعل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں مصلحت یہ تھی کہ انسان خود کو باری تعالیٰ کے لطف و کرم کا اس حد تک محتاج سمجھے کہ تمام امور کی نسبت اسی ذات کاملہ کی طرف کر دے۔ ہر چند کہ افعال کا صدور انسان ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن ہر فعل کے صادر کرنے کی قوت و ہمت اور طاقت و صلاحیت انسان کو بارگاہ رب ذوالجلال سے نصیب ہوتی ہے کیونکہ تمام قوتوں اور طاقتوں کا مبداء و سرچشمہ وہی ذات ہے۔ چونکہ تسمیہ میں بسم اللہ کے ذریعے خدا کی مدد اور اس کے فعل عنایت کا ذکر آ گیا تھا۔ اس کے بعد متکلم کا اپنا فاعل ہونا بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کے منافی تھا۔ گویا یہ تعلیم دی گئی کہ اے انسان تو ہر کام شروع کرتے ہوئے خدا کا نام لے اور اس کام کی توفیق بھی اسی ذات کی طرف منسوب کر، کبھی بھی اس فعل کو اپنا کمال نہ سمجھ کیونکہ فاعل حقیقی تو نہیں وہ ہے۔ یہاں انسانی فکر کو کبر ونخوت کی تباہ کاریوں سے بچنے کی صورت بتائی گئی ہے کہ اگر انسان زبان سے ذات حق کا نام لے کر دل میں یقین بھی اسی کی طاقت کی کارفرمائی پر رکھے گا تو سوچ کا یہ انداز اسے کبھی بھٹکنے نہ دے گا۔ یہ فکر ایمانی آداب کا لازمہ ہے۔ سورہ النساء میں اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًاO
(النساء، ۴:۷۸)

آپ فرما دیں (حقیقتاً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے پس اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتےO

یہاں صرف جائز کاموں میں توفیق کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مذکور ہے۔ اسی اندازِ سخن اور طرزِ فکر کی تلقین تسمیہ کے ذریعے کی جارہی ہے۔ یہاں ایک اور لطیف نکتہ قابلِ غور ہے کہ بسم اللہ میں چونکہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابتداِ فعل یا ارتکابِ فعل کی نسبت انسان کی طرف مذکور نہیں ہے۔ اس لئے حکم ہے کہ بسم اللہ محض جائز کاموں کے آغاز میں پڑھی جائے۔ ناجائز اور خلافِ شرع امور پر نہیں۔ کیونکہ غلط کاموں میں توفیقِ فعل کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کرنا خلافِ آدابِ بندگی ہے۔ بندے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو اپنے آقا کی طرف منسوب کرتا پھرے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ۔
(النساء، ۴:۷۹)

(اے انسان اپنی تربیت یوں کر کہ) جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہ کر) اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے اپنی خرابیٔ نفس کی طرف منسوب کر)۔

مذکورہ بالا دو آیات میں حقیقتِ حال بھی واضح کر دی گئی ہے اور آدابِ فکر و قول بھی کہ توفیق اور طاقت ہر کام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوتی ہے۔ لیکن نیکی صادر ہو تو بندگی یہ ہے کہ انسان اسے اپنے آقا کی رحمت سمجھ کر اسی کی طرف منسوب کر دے اور بدی صادر ہو تو اسے اپنی سوچ اور کاوش کا نتیجہ سمجھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی اندازِ فکر سے انسان کی اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر نظر رہتی ہے اور وہ خود تنقیدی احتساب کے ذریعے اپنی اصلاح کا طالب و خوگر ہوسکتا ہے اور دوسری طرف وہ بعض اچھائیوں کو محض اپنی صلاحیت کا ثمرہ سمجھ کر پیکرِ رعونت بھی نہیں بننے پاتا۔ چونکہ ہر کام کی توفیق اور ہمت و قدرت کا مبدا و منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لئے تسمیہ میں اسی کے مجرد ذکر پر اکتفا کیا گیا اور انسان کے فعل یا اس کے فاعل ہونے کا ذکر محذوف کر دیا گیا۔ گویا حقیقت کو عیاں رکھا اور جو کچھ محض ظاہر تھا اسے پوشیدہ کر دیا۔

آیت الحمد سے استدلال

سورہ الفاتحہ کا آغاز بھی اسی فلسفے کی نشاندھی کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَO تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے o (الفاتحہ ۱:۱)

یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب کسی کی خوبی یا تعریف ہوگی تو یقیناً کوئی نہ کوئی تعریف کرنے والا بھی ہوگا۔ کیونکہ زبان حمد کھولے بغیر بیان حمد نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہاں حمد کا ذکر ہے حامد یا فعل حمد کا بیان نہیں ہے۔ محض اس لئے کہ اگر حمد کرنے والے کا ذکر کردیا جاتا تو ممکن ہے وہ یہ سمجھتا کہ محمود میری حمد کا محتاج ہے یا میری تحمید نے اسے عظمت دی ہے حالانکہ حمد کسی کا کارنامہ نہیں۔ یہ حسن الوہیت کا اپنا استحقاق ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنا محمود ہونا بیان کر دیا۔ مگر کسی کا حامد ہونا صراحت سے بیان نہیں کیا۔

اسی طرح تسمیہ میں فعل اور فاعل کو محذوف رکھنے میں حکمت یہ تھی کہ یقیناً وہ کام جس کے آغاز میں بسم اللہ پڑھی جا رہی ہے تو کوئی نہ کوئی شخص ہی کرے گا۔ لیکن کہیں وہ اپنی فاعلیت پر ایسا گمان نہ کرنے لگے کہ یہ کام میں اپنی ہمت و توفیق سے کر رہا ہوں۔ چنانچہ خدا کا نام محض برکت کی غرض سے نہیں بلکہ اس یقین و اعتماد سے لیا جائے کہ اس کام کی توفیق بھی محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔

چوتھی حکمت

اولاً یا آخراً کسی صورت میں بھی خدا کے ماسوا کے ذکر کا تسمیہ میں نہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ واجب الوجود صرف اسی کی ذات ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ممکن ہے اور اس وجہ سے ھالک و معدوم۔ تسمیہ چونکہ تمام معارف قرآنی کا خلاصہ ہے اس لئے اس کا انداز بیان بھی دین حق کے جملہ مقاصد و مطالب کا خلاصہ ہوگا۔ **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کا آغاز و انجام صرف خدا ہی کی ذات و صفات کے ذکر پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نہ کسی فعل کا بیان ہے نہ کسی فاعل کا۔ گویا یہ الفاظ خدا کی وحدانیت کو اسی طرح اجاگر کر رہے ہیں کہ اس کائنات میں اس کے بغیر نہ تو کسی فعل کا صدور ممکن ہے اور نہ کسی فاعل کا وجود۔ بلکہ دوام حقیقی اور ثبات ابدی اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف خلاق عالم ہی کی ذات و صفات ہیں۔ وہی اول اور وہی آخر بھی ہو گا۔ اس لئے نہ اس سے پہلے کسی فعل کا ذکر ممکن ہے اور نہ اس کے بعد ارشاد ربانی ہے۔

O هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌO (الحدید ۵۷:۳)
وہی سب سے پہلے ہے اور وہی سب سے بعد بھی ہے اور وہی عیاں ہے اور وہی پنہاں اور وہ ہر شے کو جاننے والا ہے o

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ۔ (الروم ۳۰:۴)
حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

اسی امر کا بیان ایک اور مقام پر اس طرح ہے۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ (القصص، ۲۸: ۸۸)

اس کے سوا کوئی خدا یعنی واجب الوجود نہیں ہر چیز فانی ہے سوائے اس کی ذات کے۔

چنانچہ تسمیہ کے کلمات میں خدا کے سوا ہر قسم کے فعل اور فاعل کے ذکر کا محذوف و معدوم ہونا انسان کو پوری کائنات اور اس کے نظام کی بے ثباتی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کلام پکار پکار کر دنیا کی بے حقیقت رنگینیوں میں محو و مستغرق انسانوں کو حقیقت ابدی کی طرف متوجہ کر رہا ہے تاکہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہو کر بے کم و کاست اسی احکم الحاکمین کی قدرتوں اور قوتوں پر کامل ایمان لے آئیں اور اس سراب حیات کو ہی آخری منزل نہ سمجھ لیں۔ تسمیہ سے چونکہ قرآن کا آغاز ہو رہا ہے اس موقع پر جامع و مانع انداز سے خدا کی ہستی اور اس کی صفات کا ذکر اور اس کے ماسوا کا حذف و اضمار انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ دل و دماغ سے غیر کا خیال نکال دے اور ہر لمحہ ذات حق پر نظر رکھے۔ یہ معراج عبدیت ہے اور قرآن کا پہلا سبق بھی یہی ہے جیسا کہ ارشاد ایزدی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ۔ (البقرہ، ۲: ۱۱۵)

اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا ہے پس تم جدھر بھی رخ کر و ادھر ھی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔

مزید برآں وہ ایسا موجود حقیقی ہے کہ ہر وجود کا مبدا بھی وہی ہے اور مرجع بھی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں ہر وجود کائنات کا جواز بھی اسی کے وجود سے ہے۔ وہ حقیقت ہے اور اس کے ماسوا ہر شے مجاز ہے۔ اس لئے تسمیہ میں حقیقت کا ذکر کیا گیا اور مجاز کو ترک کر دیا گیا۔

حرف باء کی افادیت

کلمات تسمیہ کا پہلا حرف ''باء'' ہے۔ جس کا معنیٰ ''سے'' کیا گیا ہے یہ فعل محذوف سے متعلق ہے۔ محذوف سے مراد جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ وہ فعل اور فاعل ہے۔ جس کا ذکر یہاں لفظاً نہیں بلکہ معناً موجود ہے۔ یعنی میں شروع کرتا ہوں'' ۔۔۔ ''اللہ کے نام سے گویا حرف باء فعل محذوف کو اللہ کے نام سے ملانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حرف ''باء'' کی اپنے استعمال و افادیت کے لحاظ سے متعدد اقسام ہیں۔ جنہیں علماء نحو نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن یہاں یہ حرف ان میں سے تین اقسام پر مشتمل ہوسکتا ہے۔

۱۔ بائے الصاق و مصاحبت ۲۔ بائے استعانت ۳۔ بائے تیمن و تبرک

بائے مصاحبت

الصاق و مصاحبت کا معنیٰ اکٹھا ہونا، متصل ہونا اور رفاقت و معیت اختیار کرنا ہے۔

اس صورت میں جب کہ باء مصاحبت کے لئے تصور کی جائے تو تسمیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں اللہ کے نام کو اپنا ساتھی بناتے ہوئے، اس کے دامن رحمت سے وابستہ اور منسلک ہوتے ہوئے اور محض اسی کی رفاقت و معیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔ امام فخر الدین رازیؒ اس مقام پر فرماتے ہیں۔

هذا الباء باء الصاق فهو يلصق العبد بالرب فهو كمال المقصود

یہ "ب" بائے الصاق ہے چنانچہ یہ بندے کو رب سے ملاتی ہے اور یہی انسانی مقصود کا کمال ہے۔

(تفسیر کبیر، ۱: ۹۹)

حرف باء کے اس مفہوم کی افادیت یہ ہے کہ تسمیہ کے ذریعے انسان کو اپنے ہر کام کے آغاز سے انجام تک خدا کی رفاقت و معیت کا احساس رہے۔ یہ امر واقع ہے کہ اگر انسان کو کسی نہایت قوی، مضبوط اور ہمدرد بھی خواہ ساتھی کی رفاقت کا احساس اور یقین ہو تو اسے کسی سطح پر بھی خوف و خطر دامن گیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسان کو کارگہ زیست میں ہر خوف و غم سے بے نیاز کرنے کے لئے بسم اللہ کے ذریعے دل و دماغ میں یہ احساس جاگزیں کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو گے تو اس کی معیت بھی تمہیں حاصل ہوگی۔ جس کی حفاظت کے باعث تمہیں نہ کوئی نقصان پہنچ سکے گا اور نہ تمہاری کاوشیں بے نتیجہ ہوں گی۔ اسی تصور کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌO

اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے O

(الحدید، ۵۷: ۴)

اسی طرح شب ہجرت صدیق اکبرؓ کو غار ثور میں تنہائی کے احساس سے کچھ خدشہ سا محسوس ہوا کہ شاید کفار مکہ جو آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں تھے انہیں نقصان پہنچا دیں۔ اس پر حضور ﷺ نے ان سے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ ۔

غمزدہ نہ ہو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے ان پر اپنی تسکین نازل فرما دی۔

(التوبہ، ۹: ۴۰)

اس ارشاد پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ خدا کی معیت پر ایمان تو حضرت صدیق اکبرؓ کا پہلے سے ہی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس قدر عداوت و مخالفت کے ماحول میں اپنے گھر والوں کو اکیلا چھوڑ کر حضور ﷺ کے شریک سفر نہ ہوتے۔ لیکن ظاہرا بے سرو سامانی کا عالم، تنہائی کا ماحول اور کفار و مشرکین کے مخاصمانہ تعاقب کا خیال وقتی طور پر حزن و ملال کا باعث بنا اور یہ انسانی طبیعت کا لازمی تقاضا تھا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے صرف انہیں معیت خداوندی کی طرف متوجہ کر دیا۔ یہ احساس بحال ہونا تھا کہ دل کو سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوگئی۔ گویا معیت خداوندی قلبی

تسکین کا لازمی سبب ہے۔ یہی فلسفہ تسمیہ ہے کہ انسان خدا کی معیت و رفاقت کا احساس اجاگر کر کے جہد حیات کا آغاز کرے تو کوئی خوف و حزن اسے پریشان نہیں کرسکتا۔ خوف و حزن سے نجات پا کر انسانی جدوجہد کو وہ تازگی اور قوت میسر آتی ہے جس سے کامیابی و کامرانی کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت تگ و دو کو مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچنے دیتی' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَلا تَهِنُوا وَ تَدْعُوآ اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْO (محمد' ۴۷:۳۵)

پس تم سستی نہ کرو اور خود صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہاری کوششیں بے نتیجہ نہیں جانے دے گا۔

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ خدا کی معیت تو درحقیقت ہمہ وقت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسے اس معیت کا احساس اور شعور نہیں ہوتا۔ شعور معیت الٰہی متحقق نہ ہونے کی بنا پر وہ اس کے جملہ ثمرات و لطائف سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ تسمیہ معیت الٰہی مہیا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کا شعور بیدار کرنے کے لئے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِO (ق' ۵۰:۱۶)

اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم اس سے اس کے دل کی رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں o

اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ معیت الٰہی تو انسان کو پہلے سے ہی میسر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا شعور بیدار نہیں ہوتا۔ جب اس معیت و رفاقت خداوندی کا شعور انسان کے اندر ایک زندہ قوت بن جاتا ہے تو تمام وساوس نفسانی اور دنیوی خطرات و خدشات نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور قلب و باطن پر اس احساس کے محیط ہو جانے سے ایک عجیب لطف و سکون اور لذت و طمانیت کی مستقل کیفیت طاری ہو جاتی ہے' انسان کو پھر نہ تو کسی اور کی رفاقت کی طلب رہتی ہے اور نہ کسی کے قرب کی۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

لیکن اس لطف کا اندازہ بیان سے نہیں خود دھیان سے ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ لذت بتانے کی نہیں حاصل کرنے کی چیز ہے۔

بائے استعانت

استعانت سے مراد مدد طلب کرنا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مفہوم تسمیہ یہ ہوگا کہ 'اللہ

کے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں' حضرت نوح علیہ السلام نے قیامت خیز طوفان سے اپنے پیروکاروں کو بچانے کے لئے حکم الٰہی سے ایک کشتی بنائی اور انہیں اس میں سوار ہو جانے کو کہا۔ قرآن حکیم اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO (ہود ۱۱:۴۱)	اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اسکا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

گویا اس آیت کے ذریعے جملہ مہمات میں خدائے رحمان ورحیم کے نام سے استعانت کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت آشکار ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و اعانت کے بغیر نہ تو کسی خیر کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی شر سے محفوظ ہوا جا سکتا ہے۔ چونکہ فعل محذوف کے اعتبار سے یہاں کام کے شروع کرنے کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لئے بائے استعانت کا معنوی اطلاق یوں ہوگا کہ ''اے اللہ، میں ہر کام کے شروع کرنے میں بھی تیری مدد کا محتاج ہوں'' جب کوئی کام خدا کی مدد اور توفیق کے بغیر آغاز پذیر ہی نہیں ہو سکتا تو اس کا انجام پذیر ہونا کیونکر ممکن ہوگا۔ دراصل یہاں انسان کو اپنی حاجت مندی کا احساس دلایا جا رہا ہے تاکہ وہ دنیوی متاع کو کثرت کے ساتھ حاصل کر کے خدائے لم یزل کے حضور سر نیاز خم کرنے سے باغی نہ ہو جائے۔ انسان کے ذہن میں یہ حقیقت ہر وقت موجود رہے کہ میں رب ذوالجلال کی عنایت کے بغیر اپنی جہد حیات میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ کس قدر ظالم اور احسان فراموش ہے وہ شخص جس کا قدم بھی خدا کے لطف وانعام سے اٹھے لیکن وہ بجائے اس کی اطاعت کے اسی کے احکام کی خلاف ورزی کے لئے بڑھ رہا ہو۔ اگر انسان کا یہ شعور بیدار رہو کہ اس کی زبان کو قوت گویائی' اس کے کانوں کو قوت سماعت' اس کی آنکھوں کو قوت دید' اس کے دست و بازو کو قوت عمل' اس کے قدموں کو قوت نقل وحرکت اور اس کے دماغ کو قوت فکر الغرض سب کچھ خدا کی مدد و اعانت کے سبب میسر آیا ہے تو اس کے ظاہری اور باطنی اعضا و جوارح میں سے کوئی عضو بھی رضائے الٰہی کے خلاف حرکت میں نہ آئے۔ ہم سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے فکر میں جو تمرد وانحراف جنم لیتا ہے یہ دراصل اسی شعور وادراک کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ تسمیہ فی الحقیقت انسان کی فکری و عملی اصلاح کا شاندار ذریعہ ہے۔ اگر ہر کام شروع کرنے سے پہلے زبان اور دل خدا کا نام لینے اور اس سے مدد طلب کرنے کی طرف راغب ہوں اور یہ ان کی عادی خصوصیت بن جائے تو نواہی ومحرکات سے از خود پرہیز ہونے لگے گا۔ کیونکہ خدا کی یاد کے ہوتے ہوئے حکم خدا کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہتی۔ مزید برآں استعانت دعا ہے اور دعا خود مغز عبادت۔ اس لحاظ سے تسمیہ فی نفسہ عبادت کی روح قرار پاتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان خود کو کسی کام کے کر سکنے میں اپنے ذرائع اور اسباب ووسائل

کے باوجود ناکافی و عاجز تصور کرتا ہے اور پھر اپنی بے کسی و بے بسی کے اعتراف کے ساتھ خدائے بزرگ و برتر کی مناجات کرتے ہوئے اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ گویا انسان بارگہ ایزدی میں سراپا سوال بن کر حاضر ہے۔ وہ دنیا وما فیہا سے ناامید اور تمام اسباب سے مایوس ہو کر مسبب الاسباب کی بارگاہ میں نیازمندی کے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کی آرزومندی دل کو درد و سوز کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے اور یہی کیفیت انسان کو مقام بندگی سے ہمکنار کرتی ہے۔ بقول شخصے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو
وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل بے مدعا ہوتا

اسی مقام کو علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں

متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزومندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

قرآن میں حرف باء کا استعمال کئی مقامات پر اسی مقصد کے لئے ہوا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَO (البقرہ' ۲:۱۵۳)

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے O

یہاں صبر اور نماز دونوں کو ذریعہ استعانت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ استعانت تو لامحالہ باری تعالیٰ سے ہوگی' لیکن اس کے کامل استحقاق کے لئے صبر و نماز کو اپنا لوتا کہ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اور عنایت و اعانت زیادہ سے زیادہ نصیب ہو سکے۔ اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں واضح کیا گیا ہے۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا۔ (الاعراف' ۷:۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا تم اللہ سے مانگو اور صبر کرو۔

اسباب سے صرف نظر کر کے مسبب الاسباب پر نظر رکھنا ہی صبر کہلاتا ہے اس لئے قرآن استعانت کے ساتھ توحید مطلب کی بھی تعلیم دے رہا ہے۔ تسمیہ میں بائے استعانت سے پہلے یا بعد میں کسی اور کا ذکر نہیں۔ صرف خدا ہی کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جس کا واضح مقصد یہی ہے کہ انسان کی تمام ضروریات و مشکلات میں خدا ہی کی ذات کافی و وافی ہے۔ اسے کسی اور چیز پر توکل یا انحصار کی ضرورت نہیں۔

بائے تبرک

تبرک کا معنی برکت حاصل کرنا ہے لہٰذا بائے تبرک کے حوالے سے تسمیہ کا معنی یہ ہوگا

کہ ''اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں'' خدا کے نام سے شروع کرنا اس اعتبار سے باعث برکت ہے کہ اس کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسباب و وسائل کا مہیا کرنا بھی تو اسی کا کام ہے۔ اس لئے جب اس ذات کے مقدس نام سے برکت طلب کی جائے تو وہ ذات اس کام کا انجام تک پہنچنا آسان کر دیتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

كل امر ذی بال لم يبدا فيه بسم الله الرحمان الرحيم اقطع

جو کام بسم اللہ پڑھے بغیر شروع کیا جائے وہ دم بریدہ اور ناقص رہ جاتا ہے۔

(الدر المنثور، ۱:۱۱)

کلمہ اسم سے ذات نبوی ﷺ پر استدلال

اس وقت ہمارے پیش نظر لفظ اسم کی لغوی اور معنوی دلالت نہیں ہے۔ سر دست ہم نحوی قاعدے کے مطابق اس کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ عربی زبان میں کلمہ تین قسم کا ہوتا ہے:۔

حرف، فعل اور اسم

تمام ائمہ نحو و ادب اس امر پر متفق ہیں کہ

الحرف: هی الكلمة لا يصح الاخبار عنها ولا بها

حرف وہ کلمہ ہے جو نہ تو کسی اور کی خبر دیتا ہے اور نہ خود کسی پر دلالت کرتا ہے۔

حرف جب تک کسی اور سے منسلک نہ ہو اس میں کوئی معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی یہ از خود کسی کامل مفہوم کی نشاندہی نہیں کر سکتا، اس لحاظ سے حرف نہ ''مسند'' ہے اور نہ ''مسند الیہ''۔

الفعل: هی الكلمة لا يصح الا خبار عنها لكن يصح الاخبار بها

فعل وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ کسی اور کی خبر تو نہیں دے سکتا لیکن خود کسی نہ کسی خبر پر دلالت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے فعل ''مسند'' تو ہے لیکن ''مسند الیہ'' نہیں۔ یعنی یہ خود تو کسی عمل یا خبر پر دلالت کرتا ہے مگر کسی اور کی (یعنی فاعل کی خبر نہیں دے سکتا) جب تک کوئی اسم اس کا فاعل بن کر مذکور نہ ہو۔ اس کی اپنی معنویت بھی کامل نہیں ہوتی۔

الاسم: هی الكلمة يصح الاخبار عنها و بها

اسم وہ کلمہ ہے جو کسی اور کی خبر بھی دیتا ہے اور خود بھی کسی خبر پر دلالت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے اسم کو 'مسند اور مسند الیہ' دونوں حیثیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خود بھی کسی

نہ کسی کی خبر دیتا ہے اور اگر کوئی دوسرا اس سے منسلک ہو جائے اور اس سے نسبت پیدا کر لے تو وہ بھی بامعنی ہو کر خبر پر دلالت کرنے لگتا ہے۔ بالالفاظ دیگر اسم خود کامل بھی ہے اور ''کامل گر'' بھی۔ مذکورہ بالا تینوں کلمات کا باہمی تعلق یہ ہے کہ حرف بھی اسم سے نسبت پیدا کر کے خود کو بامعنی بناتا ہے۔ فعل بھی اسم سے نسبت پیدا کر کے اپنی معنویت اور دلالت کو کامل بناتا ہے۔ لیکن اسم ایک ایسا کلمہ ہے جو خود ہی کامل ہے۔ یہ نہ صرف خود باخبر ہے بلکہ دوسروں کو بھی باخبر کرتا ہے۔ (اپنے مقصد اور ذات معینہ پر دلالت کرتا ہے یا اس کی خبر دیتا ہے) اس کو اپنی اس حیثیت کی تشکیل کے لئے نہ کسی اور حرف کی حاجت ہے نہ کسی فعل کی۔ گویا اسم میں دلالت اور معنویت کاملہ ہوتی ہے۔ فعل میں ناقصہ اور حرف میں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔

تسمیہ میں فعل، حرف اور اسم کے باہمی تعلق پر اشارہ لطیف

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ''تسمیہ'' کے الفاظ پر غور فرمائیں۔ ''فعل'' جس کا تعلق کسی غیر سے ہو سکتا تھا۔ مثلاً ابداء یا اشرع وغیرہ (میں شروع کرتا ہوں) جیسے فعل کے بیان میں کام شروع کرنے والے کا ذکر تھا یعنی غیر از خدا کسی کا ذکر ہوتا ہے اسے حذف کر دیا گیا۔ تاکہ بسم اللہ میں کسی غیر کا ذکر ہی نہ ہو۔ کلمات تسمیہ کا آغاز ہی حرف باء سے کیا گیا جو حرف ہونے کی بنا پر اپنا کوئی معنی و مفہوم ہی نہیں رکھتا اس میں جو بھی معنویت پیدا ہوئی ہے۔ صرف اسم کے ساتھ نسبت کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ ''حرف باء'' کا مقصد محض اپنے ماقبل محذوف کو یعنی بسم اللہ کے متکلم اور فاعل کو اسم کے ساتھ ملانا ہے، پھر لفظ ''اسم'' وارد ہوا اور اس کے بعد ''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ بیان ہوئے، جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اسم کا معنی 'علامت' ہے۔ ذات وصفات باری تعالیٰ کے ذکر سے پہلے 'اسم' کا لایا جانا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ اپنی وحدانیت، الوہیت اور ہویت میں اس طرح غیر محسوس، غیر مبصر، فہم وادراک سے بالا اور عقل وخرد سے بلند ہے کہ اس تک کسی کا وہم وگمان بھی نہیں پہنچ سکتا، بندوں کا اس تک پہنچنا محال ہے۔ لہٰذا اس مخفی و باطن اور پاک ومنزہ ہستی تک وصال کے لئے کوئی ایسی علامت درکار تھی جو خود اس سے باخبر ہو اور دوسروں کو بھی خبر دے۔ جو اپنی ذات کے ظہور میں بھی کامل ہو اور اس ذات مطلق کے اظہار کے لئے بھی کامل ہو۔ یعنی وہ علامت ذات حق کے ظہور کی ایسی دلیل ہو کہ خود بھی اس سے واصل ہو اور دوسروں کو بھی اس سے ملا سکے وہ خود بھی معنی وجود پر دلالت کرے اور جس کسی کو اس سے نسبت ہو جائے اس کی معنویت اور دلالت بھی تام ہو جائے اور اس غرض سے دوسرے اس سراپا علامت سے نسبت اور تعلق قائم کرنے کے لئے مامور ہوں، گویا ایسی کامل علامت جو اپنی شان اور خاصیت میں مسند بھی ہو اور مسند الیہ بھی اور اسم کے خواص کی صحیح طور پر حامل ہو، ذات محمدی ﷺ ہی ہے۔ جس کے حق میں کیا خوب کہا گیا ہے۔

ادھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل

خواص اس برزخ کبری کو ہے حرف مشدد کا

اس لئے ''کلمہ اسم'' کے عنوان سے شان اسمیت کے عظیم آئینہ دار کا ذکر کیا گیا ہے۔

تصور دلالت اور کلمہ اسم کی وساطت

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ ''لفظ اللہ'' کی دلالت کے لئے کلمہ اسم بطور ذریعہ وارد ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''کیا ذات حق اپنی دلالت کے لئے کسی ذریعے کی محتاج ہے؟'' اس کا جواب صاف نفی میں ہے۔ بذات خود باری تعالیٰ اپنی دلالت کے لئے کسی ذریعے' واسطے اور علامت کی محتاج نہیں ہے۔ مگر ہم اس تک رسائی اور اس کی معرفت کے لئے ذریعے کے محتاج ہیں۔

یہ جواب خود عبارت تسمیہ میں ہے جو حرف باء سے شروع ہوتی ہے ''حرف باء' اپنے سے پہلے بہر صورت کسی فعل و فاعل کو محذوف کے طور پر چاہتا ہے۔ یہ محذوف وہ شخص ہے جو بارگہ الوہیت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو ''ابداء' اشرع' اقرا'' وغیرہ کا فاعل ہے اور اس شخص کو ''اسم'' یعنی علامت ذات حق سے ملانے کے لئے حرف باء درمیان میں لگایا گیا ہے۔ گویا مخلوق خدا حرف باء کے توسل سے اسم کے ساتھ اپنی نسبت پیدا کر رہی ہے' تا کہ اسم کے ساتھ نسبت اور تعلق پیدا کر کے طالبان حق کو ذات حق کی خبر' معرفت اور اس تک رسائی نصیب ہو سکے۔ جس طرح عالم امر میں اسم کا مدلول ''لفظ اللہ'' ہے اسی طرح عالم خلق میں اسم کا مدلول وجود محمد ﷺ ہے جس طرح غیر مخلوق ہونے کے اعتبار سے لفظ اللہ کی دلالت ذات حق پر کامل ہے۔ اسی طرح مخلوق ہونے کے اعتبار سے وجود محمد ﷺ کی دلالت بھی ذات حق پر کامل ہے۔ کیونکہ اسم کے جتنے بھی خواص' اعمال اور کمالات ہو سکتے ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی' معنوی ہوں یا دلالتی سب کے سب ذات محمدی ﷺ میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اسم علامت کے طور پر اس ہستی مبارکہ کو بھی بیان کر رہا ہے جو ذات حق سے واصل اور اس کی عارف بھی ہے' دیگر مخلوقات کو ذات حق کا وصال اور معرفت عطا کرنے والی بھی۔

ذات محمدی ﷺ کلمہ اسم کا مدلول کامل ہے

پورا قرآن شروع سے آخر تک اس امر کی تائید کرتا ہے کہ انبیاء و رسل اسی مقصد کے لئے دنیا میں تشریف لاتے رہے۔ وہ ذات حق کی معرفت اور اس تک رسائی کا بہترین ذریعہ اور واسطہ بھی تھے اور علامت و دلالت بھی۔ پھر یہ انبیاء و رسل ایک دوسرے پر فضیلت بھی رکھتے تھے' ارشاد قرآنی ہے۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (البقرہ، ۲:۲۵۳)

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان مین سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

انبیاء ورسل کی تمام فضیلتیں جس نقطے پر جا کر اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئیں۔ وہ نقطہ نبوت محمدی ﷺ کا تھا۔ اس لئے ذات حق پر آپ کی دلالت بھی سب سے زیادہ اکمل وافضل تھی اور آپ کی شان علامت ومظہریت بھی سب سے ارفع واعلیٰ تھی۔ اس لئے نبوت ورسالت جہاں مقام ومرتبہ کے اعتبار سے آپ کی ذات ستودہ صفات پر ختم ہوگئی۔ وہاں ادوار زمانی کے اعتبار سے بھی آپ ہی پر اختتام پذیر ہوگئی۔ چنانچہ آپ ﷺ ذات حق کی علامت تامہ اور دلالت مطلقہ قرار پا گئے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر اس حقیقت کی واضح نشاندہی کی ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًاO (النساء، ۴:۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول (ﷺ) کی طرف آجاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع) سے گریزاں رہتے ہیں O

گویا انہیں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے میں کوئی امر مانع نہیں، مگر اے محبوب ﷺ تمہاری بارگاہ میں سر تسلیم خم کرنا انہیں گوارہ نہیں اس لئے دوری اختیار کریں گے یعنی آپ سے منہ موڑ لیں گے۔

اس آیت نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ منافقت یہ ہے کہ رسول ﷺ کے واسطہ وذریعہ کے بغیر ہی ذات حق کی بارگاہ میں باریابی کے حصول کی کوشش کی جائے۔ قرآنی الفاظ میں منافقت کی پہچان یہ ہوئی کہ ''رسول ﷺ کو وصال حق کا ذریعہ نہ مانا جائے۔ اس کو معرفت حق کی علامت اور ذات حق کی دلالت تسلیم نہ کیا جائے''، یعنی منافق یہ سمجھتا ہے کہ نسبت رسول ﷺ کے بغیر ہی احکام خداوندی پر عمل باعث ایمان ثابت ہو جائے گا۔ حالانکہ قرآن اسے ''منافقت'' کہہ کر رد کر چکا ہے۔ اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَO
(المنافقون، ۶۳:۵)

''اور جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ آ ؤ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں تاکہ رسول ﷺ تمہارے لئے مغفرت چاہیں یعنی تمہیں اللہ سے بخشوا دیں تو وہ رسول ﷺ سے اپنے سر غرور کے ساتھ گھما لیتے ہیں اور تکبر کرتے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں'' O

یعنی ان کی سوچ یہ ہے کہ بخشنا تو اللہ تعالیٰ نے ہے' ہم رسول ﷺ کی بارگاہ میں کیوں نیازمندی کرتے پھریں اور ان کی سفارش وشفاعت سے زیر بار احسان کیوں ہوتے پھریں۔ کیوں نہ ہم براہ راست اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔

ان گستاخان رسالت اور بے نیازان در نبوت ﷺ کے بارے میں مزید حکم صادر کیا گیا کہ اے رسول ﷺ ! میری غیرت اور شان محبوبیت کا تقاضا یہی کہ اگر یہ...... تیرے ذریعہ اور واسطہ کو اپنا کر میری ذات تک پہنچیں گے تو انھیں بخش دوں گا۔ لیکن اس طرح تجھ سے منہ موڑ کر' تجھ سے تکبر کرتے ہوئے' تجھے میری ذات تک رسائی کا واحد ذریعہ و واسطہ اور علامت نہ سمجھتے ہوئے براہ راست مجھ سے معافی مانگنا چاہیں' یا سراپا رحمت ورافت ہونے کی بنا پر ان کے غرور و تکبر کے باوجود اپنے طور پر ان کے لئے مغفرت مانگے تو میں ان بدبختوں کو پھر بھی معاف نہیں کروں گا۔ ان کو تجھ سے منہ موڑنے کا مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔
(المنافقون، ۶۳:۶)

) ان کے لئے آپ بخشش مانگیں یا نہ مانگیں ان کے حق میں برابر ہے۔ اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

اگر یہ آپ کی سفارش' شفاعت اور غلامی کے ذریعہ کو ٹھکرا کر بھی بخشے جائیں تو پھر ان غلامان رسالت کا کیا حال ہوگا جو قدم قدم پر تیری بارگاہ میں نیازمندیاں کرتے ہیں اور تجھے میری ذات کی علامت سمجھ کر تیرے واسطے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ میں ان بدنصیبوں کو ان خوش نصیبوں کے برابر نہیں ٹھہرا سکتا اور پھر میرا دستور مغفرت ہی یہی ہے کہ لوگ بارگہ رسالت ﷺ کی وساطت سے مجھ تک پہنچیں۔

باری تعالیٰ خود اعلان فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا○

(النساء، ۴: ۶۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور (اے حبیب) اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (ﷺ) بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے۔

اس آیت کا مفہوم و مدعا سابقہ آیت کی روشنی میں سمجھا جائے تو حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ لوگ ظلم و معصیت کے بعد اگر ذات محمدی ﷺ کو واسطہ وصال الٰہی اور ذریعہ مغفرت حق مان کر در رسول ﷺ پر سر نیاز خم کر دیں، حضور ﷺ کی وساطت سے بارگاہ الوہیت تک رسائی کی آرزو کریں اور حضور ﷺ بھی ان کے لئے شفاعت و سفارش فرما دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بخشے نہ جائیں اور اگر وہ لوگ حضور ﷺ کو ذریعہ و واسطہ سمجھنے سے انکاری ہوں، بلکہ آپ کی سفارش سے ہی منہ پھیر لیں تو پھر کوئی صورت نہیں کہ وہ بخشے جائیں۔ اس لئے کہ اندریں صورت ان کی بخشش سنت الٰہی کے خلاف ہے اور ارشاد ایزدی ہوا:

وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا○

(الفتح، ۴۸: ۲۳)

اور تو ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پائے گا○

متذکرہ بالا آیات نے اس حقیقت کو اظہر من الشمس کر دیا کہ ذات حق تک رسائی کے لئے صرف اور صرف ذات محمدی ﷺ ہی واسطہ و ذریعہ اور علامت و دلالت ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کو تسمیہ میں ''کلمہ اسم'' سے تعبیر کر دیا گیا اور آپ ﷺ کو علی الاطلاق ''برھان من ربکم'' (تمہارے رب کی طرف سے حتمی و قطعی دلالت) کے لقب سے سرفراز فرمایا گیا۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی اولین تعلیم ہی یہی تھی کہ ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کاملہ تک رسائی واسطہ و علامت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ واسطہ جلیل عالم خلق میں ذات محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ جس طرح عالم امر میں لفظ اللہ ہے، بنابریں اس ذات نے اس واسطے کو محمد، احمد، حامد، اور محمود کے اسماء مبارکہ کے ذریعے اپنی شان اسمیت کے ساتھ نوازرکھا ہے۔

ذات محمدی ﷺ اور شان اسمیت

مذکورہ بالا تحقیق کا خلاصہ یہ ہوا کہ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ ''اسم'' ہیں۔ کیونکہ ان کو اللہ سے نسبت ہے اور ساری مخلوق خدا کو ان سے نسبت ہے۔ یہی اسم کی شان اور تعریف پہلے بیان ہو

چکی ہے کہ وہ مسند بھی ہوتا ہے اور مسند الیہ بھی ۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی حیثیت کو اس طرح واضح فرمایا۔

انما انا قاسم واللہ یعطی فی الدین(۱:۱۶)	بے شک نعمتوں کو مخلوق خدا میں تقسیم میں ہی کرنے والا ہوں اور مجھے عطا اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

اس حدیث صحیح کے ذریعے ذات محمدی ﷺ کی دو نسبتیں واضح ہوگئیں۔

(۱) نسبت الی الخالق

(۲) نسبت الی الخلق

''نسبت الی الخالق'' یہ ہے کہ حضور ﷺ خالق سے حاصل کرتے ہیں اور ''نسبت الی الخلق'' یہ ہے کہ خلق میں تقسیم فرماتے ہیں۔

سورہ والضحیٰ میں یہی دو نسبتیں خاص انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى	اور بے شک قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے o
فَهَدٰىo وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰىo (الضحیٰ ۹۳:۵۔۸)	کیا اللہ نے آپ کو حالت یتیمی میں نہ پایا۔ پس اس نے آپ کو بلند مقام سے دیاo اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا۔ پس اپنا قرب و وصال عطا کر دیا اور اس نے آپ کو اپنی نعمتوں کا ضرورت مند اور طلب گار پایا تو اتنا عطا کیا کہ غنی اور مالدار کر دیاo

ان آیات میں پہلی نسبت کا بیان تھا کہ جس جس چیز کی ضرورت ذات مصطفوی ﷺ کو محسوس ہوئی رب ذوالجلال نے حضور ﷺ کو عطا کر دی۔ اپنی نعمتوں اور عطاؤں کے خزانے ذات نبوی ﷺ پر اس طرح کھول دیئے کہ انہیں ''غنی'' یعنی بے نیاز کر دیا۔ اب مخلوق خدا کو حکم دیا کہ میری نعمتوں اور عطاؤں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں نے تمہارے لئے واسطہ اتم مقرر فرما دیا ہے۔ جاؤ در رسول ﷺ پر وہاں دامن سوال دراز کرو' جو کچھ مانگو گے وہی کچھ ملے گا۔ کیونکہ ہم نے عطا میں کوئی کمی نہیں کی' وہ تقسیم میں بھی کچھ کمی نہیں کریں گے۔ ساتھ ہی ''نسبت الی الخلق'' کے حوالے سے اپنے ''اسم مقدس'' کو حکم صادر فرما دیا۔

تَقۡهَرۡ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ۝ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ۝

(الضحیٰ، ۹۳: ۹۔۱۱)

محبوب! اے تقسیم کرنے والے اب اگر آپ کے پاس کوئی یتیم آئے تو اس سائل آپ کے در پر آئے۔ پس اسے خالی موڑیئے o اور اپنے رب کی عطاؤں اور نعمتوں کو ہر ایک میں تقسیم کر کے خوب چرچا کرو o

لٰہذا ذات محمدی ﷺ کی شان اسمیت یہ قرار پائی کہ آپ ﷺ ''نسبت الی الخالق'' کے نتیجے میں ذات حق کے فیضان رحمت کے مظہر اتم بن گئے اور ''نسبت الی الخلق'' کے نتیجے میں ساری کائنات میں انعامات الٰہیہ کی تقسیم کے ضامن بن گئے۔ بقول مولانا احمد رضا خانؒ

بخدا، خدا کا یہی ہے در، نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

سورہ الضحیٰ کی آیت متذکرہ ۸ اور ۱۰ اور حدیث مذکورہ بالا دونوں مقامات میں نہ عطا میں تخصیص فرمائی گئی ہے اور نہ ''تقسیم'' میں۔ عطا بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ تقسیم بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ اسی طرح سائلوں اور وابستگان پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ تم کیا مانگو اور کیا نہ مانگو۔ جو کچھ بھی مانگو گے، دنیا مانگو یا آخرت، سب کچھ ملے گا، کیونکہ ہم نے اپنے اسم مقدس ﷺ کو بلا استثنیٰ تمہاری ضرورتوں سے بھی زیادہ عطا کر دیا ہے۔ پھر اس سے قبل یہ بھی اعلان فرما دیا گیا۔

وَلَلۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ۝
(الضحیٰ، ۹۳: ۴)

محبوب! تمہاری ہر آنے والی گھڑی، گزری ہوئی گھڑی سے بہتر ہوگی o

یعنی آپ ﷺ پر ہر آن ہماری عطاؤں کا سلسلہ بڑھتا رہے گا۔ جب عطاؤں میں کمی نہیں آ سکتی، اسی طرح تقسیم میں بھی کمی یا رکاوٹ نہیں آنی چاہئے۔ چنانچہ ابد الاباد تک ذات محمدی ﷺ کی یہ دونوں نسبتیں ''نسبت الی الخالق'' جو حصول فیضان سے عبارت ہے اور ''نسبت الی الخلق'' جو تقسیم فیضان سے عبارت ہے) قائم و دائم رہیں گی۔ اس لئے قرآن کے پیغام ابدی کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کے لئے اسم مقدس ﷺ کا فیضان وساطت و رسالت بھی جاری و ساری رہے گا۔

حرف جار کی نسبت ایک لطیف نقطہ

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تسمیہ میں کلمہ اسم کو حرف جار (باء) سے منسلک کیا گیا ہے ''جر'' کے معنی کشش اور جذب کرنے کے ہوتے ہیں۔ حرف جار کشش کے لئے مقرر ہے۔ چونکہ حرف جار فعل محذوف کو اسم سے ملانے کے لئے واقع ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

جو بھی ذات حق کا ماسوی ہے اور اسے ذات باری تعالیٰ کا قرب و وصال اور معرفت و اعانت مطلوب ہے۔ وہ ذات محمدی ﷺ سے جسے بطور علامت عنوان ''اسم'' کے تحت بیان کیا گیا ہے جذب و کشش پیدا کرلے۔ اسے جس قدر ذات محمدی ﷺ کا قرب اور جذب و کشش نصیب ہوگی اسی قدر ذات حق کی محبوبیت کا سزاوار ہوتا چلا جائے گا۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔	(اے حبیب) آپ فرما دیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔
(آل عمران، ۳:۳۱)	

نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی شان کریمی کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا۔

انما مثلی ومثل امتی کمثل رجل استوقد نارا فجعلت الدواب والفراش یقعن فیه فانا اخذ بحجز کم و انتم تقحمون فیه	میری مثل اور میری امت کی مثل ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی پھر اس میں کیڑے اور پتنگے گرنے لگے اور میں پکڑے ہوئے ہوں تمہاری کمروں کو اور تم بے تامل اندھا دھند اس میں گر پڑتے ہو۔

اس حدیث کے ذریعے اس جذب و کشش کی ماہیت بھی واضح ہوگئی، جو کلمہ ''جر کے باعث اسم مقدس میں پیدا ہوگئی تھی''، اسم نحوی کا خاصہ جر من حیث الوقوع ہے اور اسم الٰہی کا خاصہ جر من حیث الصدور ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ذریعے باری تعالیٰ نے ''توحید خالص'' کی تعلیم دی، لیکن اس کی صحت و قبولیت کی شرط بھی متعین فرما دی اور وہ شرط واسطہ رسالت محمدی ﷺ ہے۔ اسی لئے اسم ذات ''اللہ'' کو علی التخصیص الرحمان الرحیم کے ذریعے صفت رحمت سے اجاگر کیا تاکہ ''شان اسمیت'' کے معنی و مفہوم پر بھی دلالت ہو جائے کہ اسم مقدس کا کامل ترین مدلول ذات محمدی ﷺ ہے جس کی شان میں قرآن مجید یوں گویا ہوا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ○ (الانبیاء، ۲۱:۱۰۷)	اور (اے رسول محتشم) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر○

www.MinhajBooks.com

باب ۳

تسمیہ میں لفظ اسم کی معنوی حکمت

www.MinhajBooks.com

تسمیہ کی تفسیر میں حرف باء کے معنی ومفہوم اور افادیت استعمال کے بعد دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ان الفاظ کو ذات باری کے ذکر سے نہیں بلکہ اسم باری کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے۔ اگر باللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو ان کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے (مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں) جو رحمان ورحیم ہے۔ لیکن یہاں الفاظ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے استعمال ہوئے ہیں۔ جن کا معنی یہ ہے کہ ''اللہ کے نام سے (مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں) جو رحمان ورحیم ہے'' الفاظ قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ براہ راست باری تعالٰی سے استعانت کی بجائے اسم باری تعالٰی سے استعانت کی تلقین کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسم کا معنی کیا ہے؟ اس کا اپنے مسمّٰی یعنی ذات وصفات باری سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کی اپنی کیا اہمیت وخصوصیت ہے، جس کی بنا پر ہر فعل مشروع کا آغاز اسی کے ذکر سے کرنے کا حکم ہے؟ کیونکہ یہ نکتہ اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ ذات وصفات باری کے ذکر پر لفظ اسم کو کیوں مقدم کیا گیا۔

لفظ اسم کا معنی

لفظ ''اسم'' نام کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی تعریف عام طور پر یوں کی گئی ہے۔

الاسم ما یعرف به ذات الشئی۔ (المفردات: ۲۴۴)

اسم وہ لفظ یا علامت ہے جس سے کوئی چیز پہچانی جائے۔

اس کے لغوی اشتقاق کے بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اسم سما یسمو سے مشتق ہے اور دوسرے وسم، یسم سے۔

(۱) سمو..... یہ لفظ اسم کا پہلا مادہ اشتقاق ہے جس کا معنی بلندی ہے۔ اسی سے السمو ہے جو بلند ہونے اور ظاہر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ آسمان کو بھی اس کی بلندی کے باعث سماء کہتے ہیں۔ نام کو محض اس لئے اسم کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے کسی شخص کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کی ذات کو ظہور ملتا ہے۔ اگر کسی کا نام نہ لیا جائے تو وہ شخصیت مخفی رہتی ہے۔ اس کے ظاہر ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ گمنامی اور اخفاء کی کیفیت سے نکل کر ذکر اور ظہور کی بلندی تک پہنچ جائے۔ کیونکہ نامعلوم کا معلوم ہو جانا یقیناً ظہور اور بلندی ہی کی ایک صورت ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔

سمو و سمو و هو الذی به رفع ذکر المسمی فیعرف به
سمواورسمو۔ اس سے مراد وہ نام ہے جس کے ذریعے مسمیٰ کا ذکر بلند اور نمایاں ہوتا ہےاور وہ پہچانا جا تا ہے۔
(المفردات: ۲۴۴)

امام فخر الدین رازیؒ اور دیگر مفسرین لفظ اسم کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فاسم الشی ما علاہ حتی ظھر ذالک الشئی به
) ہے جو اس چیز کو بلند کرے یہاں تک کہ وہ چیز ظاہر ہو جائے۔
(تفسیر کبیر ا: ۱۰۸)

اسم کے اشتقاق کے سلسلے میں یہ نقطۂ نظر علماء بصرہ کا تھا۔

(۲) وسم ...... علماء کوفہ کے نزدیک اسم کا مادہ اشتقاق وسم ہے۔

وسم، یسم، سمة ...... کا معنی علامت اور پہچان ہے۔جب کہ امام راغبؒ فرماتے ہیں۔

الوسم التاثیر و السمة الاثر
وسم تاثیر کو اور سمہ اثر کو کہتے ہیں۔
(المفردات: ۵۲۴)

قرآن میں وسم بمعنی علامت کی تائید یوں ملتی ہے۔

سِیمَاھُمْ فِی وُجُوھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُودِ۔
ان کی علامت ان کے چہروں پر نمایاں ہے جو سجدوں کا اثر ہے۔
(الفتح، ۴۸:۲۹)

قرآن پاک میں مزید فرمایا گیا۔

تَعْرِفُھُمْ بِسِیمَاھُمْ۔
تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لوگے۔
(البقرہ، ۲: ۲۷۳)

علامت اور تاثیر کے دونوں معنوں میں تطبیق یہ ہے کہ کسی چیز کی تاثیر ہی دراصل اس چیز کی صحیح پہچان اور علامت ہوا کرتی ہے۔اس لئے یہ دونوں معنی ایک ہی مدعا کو پورا کر رہے ہیں۔ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہو چکا ہے۔ کہ لفظ اسم کا پہلا معنی بھی کسی چیز کے ظاہر ہونے پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا بھی۔ گویا اسم وہ لفظ ہے جو کسی ذات کو یا اس کی تاثیر کو ظاہر کر رہا ہو۔تاثیر بالاتفاق ذات کی صفت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ''کسی ذات یا اس کی صفت کو ظاہر کرنے والا لفظ اسم کہلاتا ہے'' گویا یہ امر تحقیق کے ساتھ طے پا گیا کہ اسم ایک ایسا لفظ ہے جو کسی ذات کو یا اس کی صفات کو ظاہر اور نمایاں کرتا ہے۔اگر اسم کسی ذات کی نشاندہی کرے تو اسے اسم ذات کہتے ہیں۔ا ور صفات کی نشاندہی کرے تو اسم صفات، ذاتی اور صفاتی نام کا امتیاز اسی تقسیم پر مبنی ہے۔لفظ ''اسم'' کا الف گرا کر اس کی جگہ ''ب'' ملادیا گیا اور اس طرح باسم کی بجائے بسم معرض وجود میں آ گیا۔

اسم اور مسمی کا تعلق

اس موضوع پر زمانہ قدیم میں حشویہ، کرامیہ اور اشاعرہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسم اور مسمیٰ عین یک دگر ہیں ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ لیکن یہ موقف اس لئے درست نہ تھا کیونکہ مسمی کسی ذات یا صفت کو کہتے ہیں اور اسم اس کے مظہر یعنی ظاہر کرنے والے کو' اس لئے ان کو ایک ہی چیز تصور کرنا غلط ہے۔ مذہب مختار بھی یہی ہے کہ اسم مسمی کا غیر ہے۔ اس فرق کو یوں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ ''آگ'' کا لفظ اسم ہے اور آگ بذات خود مسمی۔ آگ کی اپنی ایک مستقل ماہیت اور تاثیر ہے جس کی بنا پر وہ جلاتی ہے۔ یہ جلانے کا کام آگ (یعنی مسمی) کا ہے۔ آگ کے لفظ (یعنی اسم) کا نہیں لیکن آگ کی نشاندہی بھی صحیح طور پر اس لفظ (یعنی اسم) کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ لازم و ملزوم تو ہیں مگر ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز بھی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں آگ کے لفظ کو بذات خود آگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تعلق اور فرق ہر اسم اور اس کے مسمیٰ کے درمیان ہوتا ہے کہ اسم اپنے مسمی پر دلالت کرتا ہے اور یقیناً اس کے بغیر مسمیٰ کی نشاندہی بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسم کو مسمیٰ یا مسمیٰ کو اسم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسم اور مسمیٰ کے امتیاز کو فلاسفہ نے متعدد دلائل سے واضح کیا ہے۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم سردست اس معاملے میں صرف قرآنی استدلال کو لیتے ہیں جو دو پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

(۲) قرآنی استدلال کے دو پہلو

ایک یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے متعدد اسماء کا ذکر کرتا ہے۔ اگر اسم (نام) اور مسمیٰ (ذات) ایک ہی چیز ہوتے ہیں تو تعدد اسماء کے ساتھ تعدد الٰہ بھی لازم آتا ہے حالانکہ ذات حق صرف ایک ہی ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَآئِهٖ۔ (الاعراف' ۷:۱۸۰)	اور اللہ ہی کے لئے اچھے اچھے نام ہیں سو اسے ان ناموں سے پکارا کرو اور ایسے لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے انحراف کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اس کی ذات کا واحد ہونا لیکن اس کے اسماء کا متعدد ہونا اس طرح مذکور ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰىO	اللہ (اسی کا اسم ذات) ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیںO

(طٰہٰ' ۲۰:۸)

قرآن حکیم اس تصور کو مزید یوں واضح کرتا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُO

(الحشر، ۵۹: ۲۴)

وہی ہے اللہ بنانے والا، پیدا کرنے والا، ہر ایک کو صورت دینے والا، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی تسبیح کرتا ہے اور وہی عزت وحکمت والا ہےO

آیات متذکرہ سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوگئی کہ ذات حق صرف ایک ہی ہے۔ لیکن اس کے اسماء متعدد ہیں اور قرآن ان اسماء کو بیان کرنے کے بعد پھر اس کی توحید کا ذکر کرتا ہے تاکہ کوئی شخص تعدد اسماء سے تعدد ذات کا استدلال نہ کرنے لگے۔ اس لئے اسم اپنے مسمی پر دلالت کرنے کے باوجود اپنی حیثیت میں اس سے الگ ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ لفظ اسم کی اضافت اللہ یا رب کی طرف کی ہے اور یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ مضاف کبھی مضاف الیہ کا عین نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کتاب زید (زید کی کتاب) اس میں کتاب کی اضافت زید کی طرف کی گئی ہے۔ لہٰذا کتاب اور زید دونوں کو ایک ہی چیز تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے درمیان تعلق اور نسبت جس قدر چاہے قریبی ہو وہ اپنے وجود میں بہرحال الگ الگ ہی رہیں گے۔ کتاب کو زید یا زید کو کتاب قرار دینا غلطی ہے۔ اس ضمن میں ارشادات باری تعالیٰ ملاحظہ ہوں۔

وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ۔

(المائدہ، ۵: ۴)

اس (شکار جانور) پر اللہ کا نام لیا کرو۔

فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ۔

(الانعام، ۶: ۱۱۸)

سو تم اس (ذبیحہ) سے کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ۔

(الانعام، ۶: ۱۱۹)

اور تمہیں کیا ہے کہ تم اس (ذبیحہ) سے نہیں کھاتے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تین آیات میں حلال جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پڑھنے کا حکم اللہ کے نام کے بارے میں ہی ہوسکتا ہے۔ ذات فی نفسھا تو پڑھی نہیں جاتی اور یہاں اللہ کا نام سے مراد ''تکبیر'' ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ جو حلال جانور اللہ کا نام لے کر یعنی تکبیر پڑھ کر ذبح کیا گیا ہوا سے کھاؤ اور جس پر تکبیر نہ پڑھی گئی ہوا سے نہ کھاؤ خواہ وہ بنیادی طور پر حلال ہی کیوں نہ ہو۔ ہر چند کہ ''اللہ'' کا نام اس کی ذات پر ہی دلالت کرتا ہے۔ یعنی نام دال ہے اور ذات مدلول۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذات کا ذکر دل میں ہوتا ہے اور نام کا زبان پر اور یہ زبان کا ذکر ہی ہے۔ جو کبھی تسبیح وتحمید کہلاتا ہے اور کبھی تہلیل وتکبیر۔ یہ فرق

ایمان کی تعریف سے مزید واضح ہو جاتا ہے جس کے دو رکن ہیں۔ اقرار باللسان (زبان سے اقرار کرنا) اور تصدیق بالقلب (دل سے تصدیق کرنا) اسی امتیاز کو قرآن حکیم کی ایک اور آیت سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًاO — اور اپنے رب کا نام لو اور سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو O

(المزمل' ۷۳:۸)

''رب کا نام لینا' بالکل واضح ہے کہ یہ اسم کا ذکر ہے اور ''سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہنا'' اس کی ذات کا ذکر ہے۔ اس جگہ حکم تبتیل کا معنی یہ ہے کہ یاد الٰہی میں اس طرح محو و منہمک رہو کہ دل ماسوی کی محبت اور یاد سے بالکل پاک ہو جائے۔ گویا اس آیت میں اسم اور مسمی دونوں کے ذکر کا حکم ہے کہ زبان اس کے نام کے ورد میں مصروف رہے اور دل اس کی یاد سے لبریز رہے' ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

تَزَكّٰىO وَ ذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰىO — ہواO اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی O

(الاعلیٰ' ۸۷:۱۴-۱۵)

سورہ علق کی پہلی آیت بھی اسی امر پر دلالت کرتی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَO — اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے پیدا فرمایاO

(العلق' ۹۶:۱)

الغرض ہر جگہ اسم اور لفظ اللہ یا رب کے درمیان اضافت موجود ہے۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اسم اور مسمیٰ دال و مدلول تو ہیں' لیکن ایک دوسرے کا عین نہیں۔ کیونکہ اسم کا ذکر پڑھنے سے ہوتا ہے اور ذات کا دل کی یاد سے یعنی سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہنے سے۔ اسم اور مسمی کے باہمی تعلق کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اسم کبھی ذات کا مظہر ہوتا ہے اور کبھی صفات کا۔ اس لئے اسم سے اس تاثیر کا ضرور پتہ چل جاتا ہے جو مسمی یعنی ذات یا صفات میں پائی جائے۔ گویا اسم سے ذات اور صفات کی نہ صرف معرفت نصیب ہوتی ہے بلکہ فی الواقع ذات وصفات تک رسائی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسم ظاہر و مظہر ہے جب کہ ذات وصفات باطن اور مخفی۔

اسم اور ذات وصفات کا باہمی رشتہ

اسم اور مسمی کے تعلق اور ذات وصفات کے باہمی رشتے کی بحث اس لئے ضروری ہے کہ اس وضاحت کے بغیر اس حقیقت کی سمجھ نہیں آ سکتی کہ تسمیہ کا آغاز بجائے اللہ کی ذات کے ذکر سے اللہ کے اسم کے ذکر سے کیوں کیا گیا ہے؟ اگر ان تینوں کے باہمی رشتے کی ماہیت کو سمجھ لیا

جائے تو یہاں پر اسم کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ کسی بھی ذات کو بغیر کسی ذریعے کے نہیں جانا جا سکتا اسے جاننے کے لئے بعض ذرائع اور وسائط ضروری ہوتے ہیں۔ ذات کو من وجہ اس کے نام کے ذریعے سے معلوم تو کیا جا سکتا ہے، سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کی صفات کا علم ضروری ہے اس امر کی تائید سب اکابر علماء کرتے چلے آئے ہیں جیسا کہ تفسیر کبیر پر مذکور ہے۔

لانعرف الذوات الا بواسطة الصفات القائمة بها	ہم ذاتوں کو ان کے ساتھ قائم اور متصل صفات کے واسطہ کے بغیر نہیں جان سکتے۔

(تفسیر کبیر، ۱:۱۱۱)

گویا ذات و صفات کا باہمی تعلق یہ ہے کہ صفات کے بغیر ذات کی صحیح معرفت نہیں ہو سکتی اور اسم ان دونوں کو جاننے کا واحد ذریعہ ہے کیونکہ اسم، ذات و صفات دونوں کا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر زید کہا جائے تو اس لفظ سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ کسی شخص کا نام زید ہے۔ لیکن زید کی ذات کا صحیح تشخص اور اس کے مقام کا صحیح تعین اس کی صفات کو جانے بغیر ہرگز نہ ہو سکے گا۔ یوں کہنا پڑے گا کہ جو عالم ہے، جو فصیح و بلیغ ہے، حسین و جمیل ہے، شاندار مقرر ہے، بڑا خلیق اور منکسر المزاج ہے، فلاں کا باپ ہے یا فلاں کا بیٹا ہے، الغرض جوں جوں اس کے اوصاف اور تعینات بیان ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کی ذات نکھرتی چلی جائے گی۔ حتی کہ اس کے ظاہری و باطنی محاسن اور صفات کے بیان سے اس کی ذات اچھی طرح معین اور متشخص ہو جائے گی۔ اب اگر زید نامی کئی اور شخص بھی موجود ہوں تب بھی ذہن کو مغالطہ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ زید کی ذات کی معرفت اس کی صفات کے ذریعے ہو چکی ہے۔ جس طرح ذات کو صفات کے ذریعے صحیح تشخص ملتا ہے۔ اسی طرح صفات کو اسماء کے ذریعے صحیح تشخص نصیب ہوتا ہے۔ کیونکہ لفظ عالم اسم ہے جو زید کی صفت علم پر دلالت کرتا ہے۔ فصیح و بلیغ اس کی فصاحت و بلاغت پر، حسین و جمیل اس کے حسن و جمال پر، مقرر اس کے فن تقریر پر، خلیق اس کے حسن خلق پر، منکسر المزاج اس کی تواضع اور انکساری طبع پر، علی ھذہ القیاس یہ تمام اسماء و اعلام جو زید کے مختلف محاسن پر دلالت کر رہے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے سے جدا جدا کر کے ان میں سے ہر ایک کی ماہیت واضح کر رہے ہیں۔ جن جن معانی پر دلالت کرتے ہیں وہی زید کی صفات ہیں۔ جس طرح معانی اپنے ظہور کے لئے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں (مثلاً سفید، سرخ، سبز، سیاہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے بغیر رنگوں کی ماہیت اور ان کا باہمی امتیاز اجاگر نہیں ہو سکتا) اسی طرح صفات اپنے ظہور و معرفت کے لئے اسماء کی محتاج ہوتی ہیں۔ مخصوص اسماء وضع کئے بغیر صفات کا تعین نہیں ہو سکتا۔ مثلاً لفظ حسن یا اس کا کوئی مترادف اسم استعمال کئے بغیر شکل و صورت کی دل فریبی اور اعضاء و جوارح کا توازن متصور نہیں ہو سکتا۔ شجاعت یا اس کا مترادف لفظ استعمال کئے بغیر جوانمردی اور بہادری کی صفت معلوم نہیں ہو سکتی۔ ذہانت و فطانت یا

ان کا مترادف لفظ استعمال کئے بغیر ذکاوت ذہنی کی کیفیت معلوم نہیں ہوسکتی۔ رحم کا لفظ استعمال کئے بغیر رقت قلبی اور شفقت وعنایت کا میلان معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح غیرت وحمیت' جود وسخا علم وفضل' عفو ودرگزر وغیرہ یہ سب الفاظ انسانی شخصیت کی مختلف صفات' عادات وخصائل اور احوال واطوار پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ خصائل وصفات اپنی ماہیت کے اعتبار سے نہ حسی ہیں نہ مرئی لیکن ان کے تشخص اور امتیاز کو قائم کرنے کے لئے انہیں مختلف الفاظ سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ جیسے مختلف اشیاء کو میز' کرسی' کتاب' قلم وغیرہ کے اسماء سے پکارا جاتا ہے۔ اگر ان اشیاء یا صفات کو ان مخصوص ناموں سے نہ پکارا جائے تو نہ ان کا صحیح بیان ممکن رہے گا اور نہ معرفت۔ چنانچہ ہر شے اپنی ماہیت ذاتی اور ماہیت عرضی کے بیان اور ظہور ومعرفت کے لئے مختلف اسماء واعلام کی محتاج ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نام کو نظر انداز کر کے کسی بھی شے کی ذات یا صفت کو نہیں جانا جا سکتا۔ گویا اسم ہی ذات وصفات' دونوں کو جاننے کے لئے واحد موثر ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اسم کا واسطہ درمیان میں نہ رہے تو نہ کسی ذات کا پتہ چل سکے اور نہ اس کی صفات کا۔ لہٰذا اسم ذریعہ ہے اور ذات وصفات کا جاننا مقصد۔

حضرت آدم اور تعلیم اسماء کی حکمت

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت علمی کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O
(البقرہ'۲:۳۱)

اور اللہ نے آدم کو (تمام اشیاء کے) نام سکھا دیئے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو O

''علم الاسماء'' کی وضاحت کرتے ہوئے تمام مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے اسماء ان کی صفات اور خواص وافعال تک کا علم عطا کر دیا تھا۔ تب ہی تو اس علم کو بنائے فضیلت آدم قرار دیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محض نام جاننے میں کونسی نمایاں فضیلت موجود تھی جس کا اعتراف ملائکہ سے سجدہ تعظیمی کی صورت میں کرایا جارہا تھا۔ اس سلسلے میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

والصحيح انه علمه اسماء الاشياء كلها ذواتها و صفاتها و افعالها۔
(تفسیر ابن کثیر'۱:۷۳)

اور صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام' ان کی ذوات اور افعال وصفات کا علم عطا کر دیا تھا۔

علامہ زمخشریؒ یہاں اسماء کے ساتھ ان کے مسمیات کا ذکر محذوف تسلیم کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

لان الاسم لابد له من مسمی۔ (الکشاف'ا:۱۲۶)

یعنی اسم بہرصورت اپنے مسمی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

مزید برآں علامہ زمخشریؒ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء کا فائدہ کیا تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی تخلیق کردہ تمام اجناس وانواع دکھا دیں اور ان میں سے ہر ایک کے نام بتائے' اس کے بعد لکھتے ہیں۔

و علمه احوالها و مایتعلق بها من المنافع الدینیه والدنیویه۔ (الکشاف'ا:۱۲۶)

اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کے احوال وخواص اور ان کے جملہ متعلقات جو دینی اور دنیاوی منافع سے منسلک تھے بتادیئے۔

امام فخر الدین رازیؒ بھی اسی قول کو دلائل کے ساتھ یوں نقل کرتے ہیں۔

صفات الاشیاء ونعوتها وخواصها (تفسیر کبیر'ا:۱۷۶)

اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھا دیئے یعنی تمام اشیاء کی صفات اور خواص واعراض سکھا دیں۔

پھر اس کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔

ان الفضیلة فی معرفة حقائق الاشیاء اکثر من الفضیلة فی معرفة اسمائها (تفسیر کبیر'ا:۱۷۶)

حقائق اشیاء کے علم ومعرفت کی فضیلت محض معرفت اسماء کی فضیلت سے زیادہ ہے۔

متذکرہ بالا دلائل کی روشنی میں جب یہ امر طے شدہ ہے کہ فرشتوں پر آدم علیہ السلام کی فضیلت اور فوقیت کو بالخصوص علم کے حوالے سے نمایاں کیا جارہا تھا۔ جیسا کہ امام بغویؒ امام خازنؒ اور دیگر مفسرین کی تصریحات سے بھی ثابت ہے۔

''فاظهر الله تعالی فضل ادم علیهم بالعلم" (تفسیر خازن'ا: ۴۲)

تو یہ فضیلت واقعۃً اسی علم سے ہی ممکن تھی جو نہ صرف اسماء کی بلکہ مسمیات کی ذوات اور جملہ افعال وصفات کی کامل معرفت عطا کرتا ہے' لہٰذا آدم علیہ السلام کی معرفت اسماء بلاشک وشبہ معرفت ذوات وصفات تھیں اور اس سے ہی آپ کی فضیلت کو اجاگر کیا جاسکتا تھا' سید قطب لکھتے ہیں۔

و لکنه وهب من الاسرار مایرفعه علی الملائکة لقد وهب سر المعرفة کما وهب سر الارادہ المستقلة التی تختار الطریق۔
(فی ظلال القرآن، ۱:۶۸)

اور آدم علیہ السلام کو وہ اسرار عطا کئے گئے جو ان کے لئے فرشتوں پر فوقیت کا باعث بن (حقائق) کا راز عطا کیا گیا۔ جس طرح کہ آپ کو ایسے مستقل ارادے کا راز عطا کیا گیا تھا جس سے کسی طریق زندگی کو اپنایا جا سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''تعلیم نامہا برای آں واقع شد کہ نام عبادت از لفظے ست کہ دلالت کند بر حقیقی ومنظور افادہ علم بحقائق بود تاکار خلافت سر انجام تو اند کرد دنام اقل آں چیز ست کہ بسبب آں امتیاز درمیان حقائق می شود ونیز منظور آں بود کہ خواص جمیع اشیاء ومنافع ومضار آں اورا تعلیم کردہ شود''
(تفسیر فتح العزیز، ۱:۱۶۶)

اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں۔

''کہ امتیاز آدم از فرشتگان ہمیں تعلیم عالم بود نہ تعلیم اسماء''
(ص ۳۸: ۱۶۷)

تعلیم اسماء کی افادیت اور حکمت کا بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالحق حقانی دہلویؒ لکھتے ہیں۔

''ہنوز اس کے استحقاق خلافت کی کوئی فضیلت خاص معلوم نہ ہوئی تھی۔ اس لئے خدائے تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے دل میں یہ القاء کر دیا کہ فلاں شے کا یہ نام ہے فلاں کا یہ۔ یعنی آدم کی سرشت میں وہ اجزائے مختلفہ اور قوائے متباینہ رکھے کہ جن سے اس کو طرح طرح کے معقولات و محسوسات، مخیلات و متوہمات، حقائق اشیاء، ان کے خواص، نام، اصول علم، قوانین صنعت اور ان کے آلات کی کیفیت کا علم معلوم ہو سکے'' (تفسیر فتح المنان)

متذکرہ بالا تمام عبارات و تصریحات سے یہی امر واضح ہوا ہے کہ علماء و محققین اسلام کے نزدیک تعلیم اسماء سے مراد وہ تعلیم ہے جو اسماء کے واسطے سے تمام اشیاء کی ذوات و صفات کے علم و معرفت پر منتج ہوئی اور اس تعلیم کو قرآن نے علم الاسماء سے محض اس لئے تعبیر کیا، کیونکہ اسم ذات اور صفات دونوں پر دلالت کرتا ہے اور دونوں کی معرفت کا باعث بنتا ہے۔ چونکہ اسم کو جانے بغیر نہ تو ذات کی صحیح معرفت ممکن تھی اور نہ صفات کی۔ اس لئے آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ O (البقرہ ۲:۳۱)

اور اللہ نے آدم کو (تمام اشیاء کے) نام سکھا دیئے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو O

یہاں یہ نکتہ مزید واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر تمام اشیاء یعنی مسمیات کو پیش کیا اور حکم دیا کہ ''ان کے نام تو بتا دو'' گویا اس بات پر زور دیا جا رہا تھا کہ اگر تم اشیاء و موجودات عالم کی ذوات وصفات اور افعال وخواص کو جانتے ہو اور انہیں اچھی طرح پہچانتے ہو تو ان سب کے نام بتا دو۔ کیونکہ نام کا جاننا ہی چیزوں کی ذات وصفات کے جاننے پر سند ہے۔ اس حکم میں اس امر کا اشارہ تھا کہ اشیاء کو ان کے ناموں کے حوالے سے ہی جاننا معتبر ہے۔ کسی شے کی ذات وصفات کی صرف اس معرفت کو قبول کیا جائے گا جو اس شے کے نام کے ذریعے سے حاصل ہوئی۔ کیونکہ نام کے بغیر کسی شے کا تعین وتشخص صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے واسطہ اسم کے بغیر ذات وصفات کی کامل پہچان ممکن نہیں رہتی۔ ورنہ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کا علم دے دیا اور فرشتوں سے بھی اسی طرح کا سوال کیا جا سکتا تھا کہ 'یہ اشیاء کیا ہیں؟'

چنانچہ تعلیم آدم کو 'تعلیم الاسماء قرار دینا اور فرشتوں سے بھی ''علم الاسماء'' سے متعلق سوال کیا جانا ''اسم'' کی اہمیت وافادیت اور ذات وصفات پر اس کی دلالت وتعلق کو نمایاں کر رہا ہے مزید برآں اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ ذات وصفات کا علم اسماء کی معرفت سے ہی نمایاں کمال کو پہنچتا ہے۔ اس لئے اسم کا ذکر مقدم کیا گیا اور ذات وصفات کا موخر۔ چونکہ اسم ذات وصفات دونوں کو ظاہر کرنے والا' ان کی معرفت اور ان تک رسائی عطا کرنے والا ہے۔ اس لئے تسمیہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ''اسم'' کے ذریعے کیا گیا' ارشاد ہوتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ O (النمل ۲۷:۳۰)

اللہ کے نام سے شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے O

یہاں ایک اور نکتہ غور طلب ہے کہ چونکہ اسم کا تعلق ذات اور صفات دونوں سے ہوتا ہے اور اس کی دلالت بھی دونوں پر ہوتی ہے۔ اس لئے ''اسم'' کے بعد متصلاً ذات وصفات دونوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اللہ ذات حق پر دلالت کرتا ہے اور **الرحمان الرحیم** اس کی صفات پر۔ اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ اسم باری تعالیٰ کی ذات کی ہی نہیں بلکہ اس کی صفات کی بھی راہ دکھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر کام کے آغاز کے لئے ایسا لفظ تعلیم فرمایا جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات دونوں طرف متوجہ اور وابستہ کرے' تاکہ انسان ذات کے فیض سے بھی مستفید ہو اور صفات کے فیض سے بھی۔

اسم کی شانِ مظہریت

تسمیہ کو اسمِ الٰہی سے شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس کے حسنِ مطلق کے بے پایاں جلووں کا مظہر ہے۔ جس طرح ذاتِ حق ازلی، ابدی، غیر محدود اور لامتناہی ہے۔ اسی طرح اس کی تمام صفات بھی جملہ حدود و قیود اور خواص، حدوث سے پاک ہیں۔ انسانی ذہن اپنی تمام تر وسعتوں اور فکری بلندیوں کے باوجود خدا کی ذات وصفات کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ جس جلوہ حسن کا ادراک اور احاطہ بھی بساطِ عقل سے ماوراء ہو، زبان کے ذریعے اس کا بیان کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جو چیز غیر محدود بلکہ غیر محسوس ہو۔ حیطہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ کسی شخص نے اس حسنِ ازل کے انسانی حواس وعقل کے حصار سے ماوراء ہونے کا ذکر کیا خوب انداز میں کیا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

لہٰذا اس کی ذات وصفات کے جلووں کا کما حقہ قابلِ بیان ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ بیان کسی کو الفاظ کا جامہ پہنا دینے کا نام ہے۔ بقول اصغر گونڈوی

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی ہے سب کچھ
جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود

چونکہ اسم کو ذات وصفات کی مظہریت حاصل ہوتی ہی۔ اس لئے اس کا ذکر کر کے گویا اس حسنِ لازوال کے تمام جلووں کی اجمالی جھلک دکھا دی گئی۔ اس لئے ''بسم'' کے دامن میں اللہ تعالیٰ کے حسنِ ذات کا جلوہ بھی ہے اور حسنِ صفات کا بھی۔ بنا بریں اسم کی اضافت ذات وصفات دونوں کی طرف کردی گئی۔ تسمیہ میں اسم اور ذات وصفات کے ذکر کے علاوہ کسی دوسری شے کا بیان اس لئے ضروری نہ تھا کہ جب ازل سے ابد تک کائنات کے تمام جلوے اور مناظر یا تو باری تعالیٰ کے حسنِ الوہیت کے آئینہ دار ہیں یا حسنِ رحمانیت ورحیمیت کے تو پھر کسی اور کا ذکر کیوں کیا جاتا۔ اسم کی شانِ مظہریت کا عالم یہ ہے کہ سب کچھ اسی کے دامن میں سمٹ آیا ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے ''بسم اللہ'' کو ہی اسمِ اعظم قرار دیا ہے۔

اگر اسم ذاتِ حق کے جلووں اور قدرتوں کا مظہر نہ ہوتا تو حرف باء کو اسم سے متصل نہ کیا جاتا۔ تسمیہ کی ترکیب باللہ الرحمٰن الرحیم نہیں بلکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ یہاں حرف باء جس معنی پر بھی دلالت کرے، وہ بہرحال اسم سے ہی متعلق ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حرف ب تین قسموں میں سے کسی بھی ایک قسم کا ہوسکتا ہے۔ (بأ صاحبت، باء استعانت، یا باء تبرک) انسان ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ کے ذریعے یا تو خدا کے نام کی معیت و مصاحبت پر بھروسہ کرتا ہے یا خدا کے نام سے مدد کا طلب گار رہتا ہے یا خدا کے نام سے برکت کے حصول کا آرزومند ہوتا ہے۔

الغرض ہر صورت میں انسان کو خدا کے نام سے ہی استمداد کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اسم اور مسمّٰی میں ہر چند کہ دال اور مدلول کا تعلق ہے، لیکن اسم بہرحال اسم ہے اور مسمّٰی بہرحال مسمّٰی۔

جس طرح آپ ذات کو صفت سے جدا نہیں کر سکتے۔ لیکن دونوں کو ایک دوسرے کا عین بھی تصور نہیں کر سکتے مگر تسمیہ اس امر کی شہادت پیش کر رہا ہے کہ جو فیضان اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ہے وہی اس کے مبارک اسم سے بھی حاصل ہو کر رہے گا۔

چونکہ اسم مسمیٰ کا مظہر ہوتا ہے اسی لئے اسے مسمی کے ذریعے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے تعلق و وابستگی، اس کی معرفت اور آگہی، اس کی رضا و بقاء، اس کے جلوہ حسن میں فنا و استھلاک اور اس کی صفات و کمالات سے تخلق و اتصاف انسان کا اعلیٰ ترین نصب العین اور منتہائے کمال ہے۔ اور اسی مقصد کی خاطر انسان خدا کی معیت و استعانت اور اس سے حصول برکت کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن بجائے براہ راست خدا کی ذات سے تمسک و استمداد کے تسمیہ انسان کو اس کے نام کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

بیان اسم کے چند اسرار

اس کے چند اسرار درج ذیل ہیں۔

ا۔ ایک یہ کہ نام، ذات تک رسائی کا ذریعہ ہے بلکہ ذات کی معرفت بھی نام ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ چونکہ واسطہ اسم کے بغیر انسان جلوہ ذات تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے اسے بطور ذریعہ اپنانے کی تعلیم کی گئی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ہر کام میں نام سے ابتدا ہوتی ہے اور منزل ذات پر انتہا۔ چونکہ ذات حق کے انوار و تجلیات کا برداشت کرنا اور سمیٹنا ایک مبتدی کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ انسان کو تجلیات ذات اور تجلیات صفات کو جذب کرنے اور نئی کیفیات کو اپنے قلب و باطن میں سمونے کا اہل بنایا جائے اور یہ اہلیت و صلاحیت بغیر ممارست کے ممکن نہ تھی۔ اس لئے اسم باری سے وابستگی کی راہ دکھائی گئی تا کہ یہ ابتدا انسان کو مطلوبہ انتہا تک پہنچنے کا اہل بنا سکے۔ چونکہ اسماء باری تعالیٰ کے انوار اس کی ذات وصفات کے انوار کے مقابلے میں زیادہ قابل برداشت ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان روحانی قوت و استعداد اور وسعت باطنی حاصل کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذات وصفات کے جلووں کا نظارہ کرنے کا بھی اہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے سلوک میں صوفیاء کرام مختلف اسماء الٰہیہ کے بکثرت ذکر اور ورد کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے اپنے طریقے کے مطابق بعض اسماء کا بالالتزام بڑی کثرت کے ساتھ وظیفہ کرواتے ہیں۔ جن میں نفی و اثبات (یعنی لا الہ الا اللہ) اسم ذات (یعنی اللہ) اور دیگر اسماء صفات (مثلاً وھاب، ودود، علیم، بصیر، نور، ظاہر وغیرہا) شامل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے اذکار متعدد احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہیں اور ان ہی ارشادات رسالت مآب ﷺ پر صوفیاء کی تعلیمات کا انحصار ہے۔ لیکن جہاں تک ان اذکار و اوراد کی حکمت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اسماء کے ذکر سے خصوصی انوار نصیب ہوتے ہیں جن کے

باعث انسان رفتہ رفتہ باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے انوار کا مرکز و مہبط بنتا چلا جاتا ہے۔ اور آسانی سے انہیں بھی اپنے اندر جذب کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔ روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں صحابہ کرامؓ کو ذکر سے خصوصی کیفیات اور مکاشفات حاصل ہوتے تھے۔ لیکن یہ حالت ذکر کے علاوہ ہمہ وقت موجود نہ رہتی تھی۔ یہ ماجرا حضرت حنظلہ بن ربیع اسیدیؓ نے ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا جس پر حضور ﷺ نے فرمایا۔

لوكانت تكون قلوبكم كما تكون عند الذكر لصافحتكم الملائكة حتى تسلم عليكم فى الطرق
(صحیح مسلم، کتاب التوبہ، ۲: ۳۵۵)

اگر تمہارے دلوں کی کیفیت ہمیشہ وہی رہے جو دوران ذکر ہوتی ہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کریں اور راستوں میں چلتے ہوئے بھی تمہیں سلام کہیں۔

ایک اور روایت کے الفاظ یوں ہیں۔

لصافحتكم الملائكة على فرشكم و فى طرقكم
(صحیح مسلم، ۲: ۳۵۵)

تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں پر تم سے مصافحہ کریں۔

اسماء باری تعالیٰ کے بکثرت ذکر کے بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

قال رسول ﷺ ان لله تعالى تسعة و تسعين اسما مائة الا واحده من احصاها دخل الجنه
(صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب مایجوز من الاشتراط، ۱: ۳۸۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں جو ان کا ذکر کرے گا۔ جنت میں داخل ہوگا۔

مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ اسم باری تعالیٰ کا ذکر بذات خود بڑی برکت وفضیلت کا حامل ہے اور اس سے انوار ذات وصفات کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تسمیہ کا آغاز اسم الٰہی سے کیا گیا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ یہ عالم دراصل عالم اسباب ہے۔ اس میں اسباب و ذرائع سے استفادہ اور اکتساب فیض نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ تسمیہ چونکہ ہر کام کے آغاز میں پڑھے جانے کا حکم ہے اور اس کا بیان بھی اسم سے شروع ہوتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت کا ذریعہ ہے اور تسمیہ میں اسی ''ذریعہ'' سے مصاحبت، استعانت اور حصول تبرک کی تلقین ہے۔ لہٰذا حکم تسمیہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جو جو خدا کی ذات سے وابستہ ومنسلک ہو۔ اس کے فیضان کا ذریعہ ومظہر ہو اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والا ہو۔ اس سے کسب فیض عین حق

وصواب ہوگا۔لیکن اس سے استعانت اور حصول برکت ذریعے کی حیثیت سے ہوگی نہ کہ حقیقت کی حیثیت سے۔حقیقت میں مستعان اور معطی رب ذوالجلال ہی کی ذات ہوگی۔جس کا فیض قدرت مختلف ذرائع واسباب کی صورت میں بنی نوع انسان تک پہنچ رہا ہے' کوئی شخص کسی دوا سے شفایاب ہو یا دعا سے یہ سب باری تعالیٰ ہی کا فیضان ہے۔جس نے انسانوں کی تخلیق کردہ اور تجویز کردہ دوا میں تاثیر شفاء رکھ دی اور یہی حال کسی برگزیدہ کی دعا کا ہے کہ جس کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی تاثیر و برکت رکھ دی ہے۔ورنہ یہ فیض اور منفعت نہ دوا کی ذاتی خوبی تھی اور نہ کلمات دعا کی۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان سے مل کر مصر سے اپنے گھر واپس لوٹنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے انہیں اپنا قمیض دیا اور فرمایا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا۔ (یوسف' ۱۲: ۹۳)	میرا یہ قمیض لے جاؤ سو اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا۔ (یوسف' ۱۲: ۹۶)	پھر جب خوشخبری سنانے والا آ پہنچا اس نے وہ قمیض یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو اسی وقت ان کی بینائی لوٹ آئی۔

آنکھوں کی بینائی کا جانا اور اس کا پھر لوٹ آنا ہر چند کہ یہ سب کچھ اذن الٰہی سے ہوا تھا لیکن دونوں امور کسی نہ کسی ذریعے ہی کے باعث معرض وجود میں آئے تھے۔ان کی بینائی یوسف علیہ السلام کی جدائی کے غم میں جاتی رہی تھی۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ۔ (یوسف' ۱۲: ۸۴)	اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں۔

چنانچہ اس بینائی کو لوٹانے کے لئے بھی قدرت نے یوسف علیہ السلام ہی ذریعے کو منتخب فرمایا۔یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام دونوں خدا کے پیغمبر تھے۔وہ خود بینائی کے لئے دعا بھی مانگ سکتے تھے' لیکن ایسا نہیں ہوا۔بجائے اس راستے کے نبیؑ کی بابرکت قمیض کی وساطت اور توسل سے مدعا حاصل کیا گیا۔تاکہ عالم اسباب میں سبب اور ذریعے کی اہمیت واضح ہو سکے اور لوگ دینی و دنیوی امور میں اپنے معاملات کی تکمیل کے لئے ذرائع اور وسائل سے استمداد و اکتساب کو انبیاء علیہم السلام کی سنت سمجھتے ہوئے جاری رکھ سکیں۔یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ ایک قمیض جو عام کپڑے سے بنا ہوا تھا۔فی نفسہ ایسی صلاحیت اور توفیق سے بہرہ اندوز نہیں ہو

سکتا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے مبارک جسم سے مس ہونے کی بنا پر اس میں معجزانہ تاثیر پیدا کر دی تھی۔لہٰذا اس سے استفادہ اور اکتساب فیض عین منشاء ایزدی قرار پا گیا۔

ذرائع سے اکتساب فیض اور انتساب فعل کا مسئلہ

مزید برآں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اس عالم اسباب میں کوئی کام کسی سبب اور ذریعے کے توسط سے ہوا ہو تو اس کام کی نسبت بھی اس ذریعے کی طرف کی جا سکتی ہے، لیکن یہ نسبت مجازی ہو گی حقیقی نہیں، کیونکہ فاعل حقیقی تو ذات حق ہی ہے۔ قرآن کریم میں اس تصور کی اصل یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کی طرف جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا تا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کی بشارت دیں تو انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّاO

(مریم، ۱۹:۱۹)

(جبریل نے) کہا میں تو فقط تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں (اس لئے آیا ہوں) کہ میں تجھے ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروںo

اولاد عطا کرنا بلاشبہ رب العزت کا کام ہے اور اس کے سوا یہ قدرت کسی کو حاصل نہیں۔ لیکن یہاں جبرئیل امین ''بیٹا عطا کرنے'' کی نسبت اپنی طرف کر رہے ہیں کہ میں تجھے ایک ستھرا بیٹا دینے آیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ عیسیٰؑ کا تولد بغیر رشتہ ازدواج کے ہوا تھا۔ اور ان کے تولد کا کوئی عادی و طبعی سبب ظاہر میں موجود نہ تھا۔ جبرئیل امینؑ نے حضرت مریمؑ کے گریبان یا دامن میں دم کیا جس سے وہ حاملہ ہو گئیں اور بالآخر عیسیٰ علیہ السلام کا تولد وجود میں آیا۔ چونکہ تولد عیسیٰؑ کا ظاہری سبب اور ذریعہ صرف جبرئیل علیہ السلام کا دم کرنا تھا۔ اس لئے مجازاً وہب الٰہیہ کو انہوں نے اپنی طرف منسوب کر دیا تمام مفسرین بالاتفاق اس امر کی تصدیق کرتے ہیں، وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

اسند الفعل الی نفسہ مجازا لکونہ سببا ظاھریا بالنفخ فی الدرع

(تفسیر البیضاوی، ۶:۸۸)

قمیض میں پھونک مارنے کے ظاہری سبب کی وجہ سے فعل کی نسبت حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف کرنا مجازاً ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی، مادی ہو یا روحانی کسی ذریعے کا موثر اور فعال ہونا اور صدور فعل کی نسبت کا اس ذریعے کی طرف کیا جانا اس لئے درست ہے کیونکہ یہ بھی بالواسطہ قدرت الٰہیہ کا ہی اعتراف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس ذریعے کو تاثیر وفعالیت سے نہ نوازتے تو وہ کبھی بھی صدور فعل کا باعث نہ ہو سکتا۔ جب اس کو ذریعے اور سبب کا درجہ ہی خلاق عالم اور مسبب الاسباب نے بخشا ہے اور وہی ذات اسے اسباب وعلل کی دنیا میں موثر کارفرمائی کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور کر رہی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ وہ لوگوں کے اس کی طرف متوجہ ہونے یا نسبت فعل اس کی طرف کئے جانے کو خود ناپسند کرنے لگے اور ان امور کو

غیرت الوہیت یا شان توحید کے منافی سمجھے۔ یہ اس کے انداز پروردگاری کے خلاف ہے۔

اسی طرح متعدد قرآنی امثلہ اور احادیث کے اسالیب ایسے انداز بیان پر شاہد وعادل ہیں، جن میں صدورِ فعل کی نسبت سبب حقیقی کی بجائے مجازاً ظاہری سبب کی طرف کی جاتی ہے، جیسا کہ روزمرہ کی گفتگو کا معمول ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ عالم اسباب میں مادی وغیر مادی ذرائع ووسائط سے نہ صرف استعانت واستمداد جائز اور مشروع ہے بلکہ ان کی طرف نسبت فعل بھی درست ہے۔ لیکن یہ اعتقاد مجروح نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی حیثیت محض ذریعہ ووسیلہ کی ہے مقصد کی نہیں اور ان کی طرف انتساب افعال مجازاً ہوتا ہے حقیقۃً نہیں۔ فاعل حقیقی اور قادر مطلق رب ذوالجلال کی ذات ہے۔

تسمیہ کی عبارت اسم سے استعانت واستمداد اور مصاحبت وتبرک کے حوالے سے یہی تعلیم دے رہی ہے کہ انسان اپنے جملہ امور میں ان تمام ذرائع واسباب سے استعانت کرے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عون وامداد کے مظاہر کے طور پر عالم آب گل میں وجود بخشا ہے اور جن کی مدد خدا کے مالک ومعین ہونے کی نشاندہی کر رہی ہے لیکن اسباب وذرائع کو کبھی بھی مقصد کا بدل نہ بنایا جائے۔ انسان کو چاہئے کہ ان سب ذرائع سے حاصل ہونے والے منافع ونقصانات میں بھی اصل نظر خدا ہی کی قدرت مطلقہ پر رکھے۔ اس لئے ''بسم'' میں نام حق سے استعانت کی تعلیم دے کر ذریعہ کی اہمیت بھی واضح کر دی گئی اور اس کی اضافت 'اللہ الرحمٰن الرحیم کی طرف کر کے حقیقت حال کو بھی بیان کر دیا گیا۔

اگر غور وخوض اور فہم صحیح کے ساتھ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا جائے تو ''مسئلہ استعانت واستمداد'' پر مذہبی حلقوں میں موجود علمی نزاع کافی حد تک مرتفع ہو سکتا ہے۔ (اس مسئلے کو تفصیل سے سمجھنے کے لئے مصنف کی کتب 'عقیدہ توسل' اور 'مسئلہ استغاثہ' کو پڑھ سکتے ہیں)۔ ہندوستان کے دور آخر کے علماء ومحققین کی تحقیقات وتصریحات کا بھی مطالعہ کیا جائے تو مذکورہ بالا وضاحت کی تائید ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں دو علماء کے نقطہ ہائے نظر ملاحظہ ہوں۔

سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ایاک نعبد وایاک نستعین کے تحت مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ایاک نستعین'' میں یہ تعلیم فرمائی کہ استعانت خواہ بواسطہ ہو یا بے واسطہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ حقیقی مستعان وہی ہے۔ باقی آلات وخدام واحباب وغیرہ سب عون الٰہی کے مظہر ہیں بندے کو چاہئے کہ اس پر نظر رکھے اور ہر چیز مین دست قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیاء وانبیاء سے مدد چاہنا شرک ہے عقیدہ باطلہ ہے، کیونکہ مقربان حق کی امداد امداد الٰہی ہے۔ استعانت بالغیر نہیں۔

اب اسی آیت کے تحت متذکرہ بالا مفہوم کو مولانا محمود الحسن دیوبندی ان لفظوں میں

بیان کرتے ہیں۔

''اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔''

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ دونوں عبارات کا مفہوم و مدعا ایک ہی ہے۔ تسمیہ میں لفظ اسم کے استعمال سے بھی انسانوں کو یہی تعلیم دینا مقصود تھا کہ جملہ امور حیات میں مستعان حقیقی صرف ذات باری تعالیٰ ہے لیکن اس عالم اسباب میں ہر مخلوق و موجود کو خلاق عالم نے اپنے فیضان رحمت اور اپنی مدد و اعانت کے واسطہ و مظہر کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ جو ہستی ذات حق کے جتنی قریب اور اس کے نور قدرت سے جتنی مستنیر ہوگی وہ اسی قدر شان مظہریت میں بھی اعلیٰ و اولیٰ ہوگی۔ لہٰذا کاروبار حیات میں مادی مسائل ہوں یا روحانی ان سے استفادہ واستمداد بھی کیا جائے کہ نظام کائنات کا اصول بھی یہی ہے اور ہر ایک اعانت میں کارساز حقیقی کے لطف و کرم پر بھی نظر رکھی جائے کہ تقاضائے بندگی یہی ہے۔

www.MinhajBooks.com

باب۴

لفظ اللہ کے تفسیری معارف

www.MinhajBooks.com

لفظ اللہ کی اسمی اہمیت

تسمیہ میں استعمال ہونے والا دوسرا لفظ ''اللہ'' ہے جو ذات باری تعالیٰ پر دلالت کرتا ہے۔اسی وجہ سے اسے اسم ذات کہتے ہیں اوراس کے علاوہ باقی سب ناموں کو اسمائے صفات۔ یہ لفظ باری تعالیٰ کی ان تمام صفات حسن وکمال کو حاوی ہے جن سے وہ متصف ہے۔ ذات اور صفات کا تعلق اجمالی طور پر پہلے بیان ہوچکا ہے۔ کسی بھی ذات کا صحیح ادراک اس کی صفات کو جاننے ہی سے ممکن ہوتا ہے۔لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام صفات وکمالات کو جانا جائے۔ محض چند صفات کے حوالے سے کسی شخصیت کی جزوی اور نامکمل معرفت تو حاصل ہوسکتی ہے۔اس کا جامع تعارف ممکن نہیں۔ اسم ذات' شخصیت کی من حیث الکل نشاندہی کرتا ہے۔

اس کی دلالت محض شخصیت کے کسی خاص گوشے یا پہلو پرنہیں ہوتی۔ جب کہ اسمائے صفات میں سے ہر ایک اسم' ذات کی کسی نہ کسی ایک صفت کوہی اجاگر کرسکتا ہے۔مثلاً قدیر اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت پر دلالت کرتا ہے۔علیم اس کی صفت علم پر' حی اس کی صفت حیات پر' کلیم اس کی صفت کلام پر' سمیع وبصیراس کی صفات سمع وبصر پر' خالق اس کی صفت خلق پر' رب اس کی صفت ربوبیت پر اور رحمان ورحیم اس کی صفت رحمت پر۔الغرض یہ سب اسماء ذات باری تعالیٰ کی مختلف صفات کی نشاندہی کررہے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو جمیع صفات الوہیت کا احاطہ کرسکے اوراس کو سنتے ہی اس حسن مطلق کا ایسا تصور ذہن میں آسکے' جو من کل الوجوہ مکمل ہو ''اللہ'' ہی ایک ایسا نام ہے جس کی دلالت کلی طور پراس واجب الوجود پر ہے جو جامع صفات و کمالات ہے۔ یہ ذات حق کی کسی ایک یا چند صفات کی نہیں بلکہ بیک وقت ذات اوراس کی تمام صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ صفات ایک اعتبار سے گویا ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب کہ ذات اپنی کسی بھی صفت کا حصہ نہیں ہوتی۔ ذات کے دامن میں اس کی تمام صفات ازخود موجود ہوتی ہیں۔اس لئے اسم ذات بھی جملہ صفات وکمالات کو پورے طور پر محیط ہوتا ہے۔

قرآن اور بیان اسم ذات

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں بھی باری تعالیٰ کے حسن صفات وکمال کا ذکر آیا ہے۔ اس کا آغاز بالعموم اسم ذات سے ہی ہوا ہے۔اس کے ساتھ باقی اسماء حسنیٰ کا بیان یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اجمال کی تفصیل بتائی جارہی ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَانُ الرَّحِیْمُO
(الحشر، ۵۹: ۲۲)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر نہاں وعیاں کا جاننے والا، وہی ہے بڑا مہربان رحمت والاO

اس سے آگے پھر فرمایا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَO
(الحشر، ۵۹: ۲۳)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، نہایت پاک، سلامتی دینے والا، امان بخشنے والا، حفاظت فرمانے والا، عزت والا، عظمت والا، تکبر والا، اللہ پاک ہے ان کے شرک سےO

اس سے اگلی آیت کا بھی انداز بیان یہی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُO
(الحشر، ۵۹: ۲۴)

وہی اللہ ہے بنانے والا، پیدا کرنے والا، ہر ایک کو صورت دینے والا، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور عزت و حکمت والا ہےO

اسی طرح آیۃ الکرسی میں بھی صفات و افعال خداوندی کے بیان کا آغاز اسم ذات سے ہی ہوا ہے۔ مزید برآں قرآن حکیم میں جا بجا ذات باری تعالیٰ کا تعارف اسی مقدس نام کے ذریعے کرایا گیا ہے، چند مقامات ملاحظہ کیجئے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ۔
(الرعد، ۱۳: ۱۶)

فرمایئے! کون رب ہے آسمانوں اور زمین کا، آپ ﷺ خود ہی فرما دیجئے اللہ ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلِ اللّٰهُ۔
(السباء، ۳۴: ۲۴)

(ان کافروں کے سامنے) فرمایئے کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ آپ (خود ہی) فرما دیجئے اللہ ہے۔

ایک مقام پر کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔
(العنکبوت‘۲۹:۶۱)

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کس نے بنائے آسمان اور زمین اور (کس نے) کام میں لگائے سورج اور چاند تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔

اس سے آگے پھر فرمایا گیا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔
(العنکبوت‘۲۹:۶۳)

اور اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کس نے اتارا آسمان سے پانی۔ پھر اس کے سبب سے زمین کو مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○
(الروم‘۳۰:۱۱)

اللہ ہے جو پہلے بناتا ہے‘ پھر دوبارہ بنائے گا۔ پھر تم اسی کی طرف پھرو گے ○

اسی صورت میں مزید فرمایا گیا۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ۔
(الروم‘۳۰:۴۰)

اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں روزی دی پھر تمہیں مارے گا۔ پھر تمہیں جلائے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔
(السجدہ‘۳۲:۴)

اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا۔

علیٰ ہذا القیاس ہر جگہ باری تعالیٰ نے اپنی ذات کا تعارف لفظ اللہ کے حوالے سے ہی کرایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ صفات و کمالات ربوبیت کا ذکر بھی اسی نام سے شروع کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کا یہ انداز بیان نہ صرف اس کے اسم ذات ہونے پر بلکہ اس کی اہمیت‘ جامعیت اور ہمہ گیریت بھی دلالت کرتا ہے۔

یہ اسم ذات (اللہ) قرآن حکیم میں کم و بیش ستائیس سو ایک (۲۷۰۱) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی کثرت سے کوئی دوسرا لفظ قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

مذاہب عالم اور تصور اسم ذات

تاریخ عالم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب میں خواہ توحید کا عقیدہ غالب رہا یا شرک کا، ذات باری تعالیٰ کی نسبت لوگوں کے اذہان میں کوئی نہ کوئی ایسا تصور ضرور موجود رہا ہے۔ جسے وہ تمام کائنات کا خالق و مالک سمجھتے تھے۔

اس ذات کی نشاندہی وہ اپنی اپنی مخصوص اصطلاحات کے ذریعے کرتے رہے۔ مثلاً ہندو دھرم میں ''پرمیشور'' کا لفظ عام دیوی دیوتا کے لئے نہیں بلکہ رب کائنات کے لئے بولا جاتا ہے۔ ''برہم'' بھی اسی ہستی کا نام ہے۔ اسی طرح ہندو یوگ میں روحانی منازل طے کرنے کے لئے 'اوم'' کا ورد بطور ذکر اسم ذات مروج ہے۔ بلکہ یجروید جو ہندو دھرم کی مقدس مذہبی کتاب ہے کے آخر میں بھی ''اوم'' کو 'برہم'' کا ذاتی نام لکھا گیا ہے۔ لیکن رگ وید ۴۔ ۱۸۔ ۶ میں جو منتر مذکور ہے۔ اس میں ندیوں کے اللہ، اللہ شبد پکارنے کا ذکر آتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قدیم ہندو لٹریچر میں بھی ذات حق کے لئے لفظ 'اللہ'' بطور اسم ذات مستعمل تھا۔ مذہب زرتشت کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی ''آہورمزدا'' کو خالق کائنات کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ المنعم ، المکین، الکامل، القدس، الحکیم، الخبیر، الغنی، الطیب، القہار، الشافی، الخلاق، العلیم وغیرہا۔ یہ سب اس کے اسماء صفات ہیں اور اس کا اسم ذات ھرمز ہے۔ علامہ محمود العقاد اپنی کتاب ''اللہ'' میں جناب زرتشت کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ زرتشت نے پکارا۔

''یا هرمز الرحیم صانع العالم المشهود، یا ایها القدس ..... ای شئی هو اقوی القوی جمیعا فی الملک والملکوت، فقال هرمز ..... انه هو اسمی الذی یتجلی فی ارواح العلیین فهو القوی فی عالم الملکوت''

ایک اور مقام پر زرتشت کے حوالے سے منقول ہے۔

ان هرمز خلق الدنیا فی سته ادوار۔ کہ ہرمز نے دنیا کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔

گویا باری تعالیٰ (یعنی آہورمزدا) کے لئے مذہب زرتشت میں'' ہرمز کا لفظ اسم ذات کے طور پر منقول ہے۔ مختلف سامی زبانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں باری تعالیٰ کے اسم ذات کے طور پر جو نام عام طور پر معروف رہا ہے۔ اس کا مادہ الف، لام اور رہ پر مشتمل ہے۔ عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری اور عربی وغیرہ سب زبانوں میں یہی مادہ مختلف شکلوں میں پایا جاتا رہا ہے۔ کلدانی اور سریانی میں الاھیا عبرانی میں الوہ اور عربی میں الہ جو ''ال'' کے اضافے اللہ قرار پا گیا۔ الغرض ہر دور میں ہر طبقہ وملت کے افراد باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا جامع لفظ ضرور استعمال کرتے رہے ہیں، جس کی دلالت ہمہ گیر ہو اور جس سے بلا شرکت غیرے صرف ایک ہی ہستی کا سراغ مل سکے۔

لفظ اللہ کی شان علمیت

سیبویہ، خلیل اور دیگر فقہاء واصولیین میں سے امام شافعی، خطابی، امام الحرمین اور امام

غزالی وغیرہم کے قول کے مطابق لفظ ''اللہ'' اسم علم غیر مشتق ہے۔ یعنی یہ لفظ صرف ذات باری تعالیٰ کے نام کے طور پر وضع کیا گیا ہے اور بلا شرکت غیرے اسی پر ہی دلالت کرتا ہے۔ نہ یہ خود کسی لفظ سے ماخوذ ہے اور نہ اس سے کوئی اور۔ گویا یہ لفظ خود بھی لفظی اور معنوی اعتبار سے توحید محض کی دلیل ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا○

(مریم، ۱۹: ۶۵)

(وہ) آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دو کے درمیان ہے (سب) کا رب ہے پس اس کی عبادت کیجئے اور اس کی عبادت میں ثابت قدم رہیئے o

اس آیت میں جس حقیقت کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس خلاق کائنات اور معبود برحق کی شان توحید کا یہ عالم ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ اسمی شرکت بھی حاصل نہیں۔ اس کی وحدانیت اس قدر بظاھر و باہر ہے کہ مشرکین نے معبودان باطلہ کے لئے طرح طرح کے نام اور صفات وضع کر رکھی تھیں۔ لیکن آج تک کسی نے بھی اپنے کسی جھوٹے معبود کا نام ''اللہ'' نہیں رکھا لہذا یہ نام بھی اپنے وجود میں شروع سے آخر تک بے مثل اور بے نظیر رہا ہے۔ تاریخ عالم بھی اس حقیقت کی کھلی تائید کرتی ہے مولانا ابوالکلام آزادؒ اسی تصور کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''کہ نوع انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے مظاہر فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہوگئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے۔ جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم و بیش موجود رہا اور اس لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہوگئے وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا'' قرآن حکیم نے بھی کفار و مشرکین مکہ کے معتقدات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی بات کو واضح کیا ہے وہ کہتے تھے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔

(الزمر، ۳۹: ۳)

ہم تو انھیں (یعنی بتوں کو) صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں۔

ہر چند کہ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کے لئے ان کا یہ استدلال اسلام کے نزدیک قابل

قبول نہ تھا، لیکن اس سے اتنی بات ضرور عیاں ہوگئی کہ وہ بھی تمام معبودان باطلہ پر کسی ایک ہستی کو فائق و برتر اور کامل و برگزیدہ تصور کرتے تھے۔ اسی کے قرب کو اپنا منتہائے مقصود بیان کرتے اور اسی ہستی کو اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ یہ اس لفظ کی اپنی موزونیت اور انفرادیت ہے کہ اس ہستی مطلقہ کے لئے یہ لفظ بغیر کسی کی شراکت کے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جب ہم اس لفظ کی شان علمیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ذات والاصفات کے بیان کے لئے واقعی اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کوئی نہ ہوسکتا تھا۔ لفظ اللہ کی تعریف امام خازنؒ نے یوں کی ہے۔

هو اسم علم خاص لله تعالى تفرد به البارى سبحانه وتعالى ليس بمشتق ولا يشركه فيه احد

یہ اسم علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور باری تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس میں کوئی اور شریک ہے۔

(تفسیر خازن، ۱: ۱۵)

لفظ اللہ کی ترکیب اور اس کی معنوی حکمت

۱۔ اس لفظ کا باری تعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت سے مستعمل ہونا کئی حکمتوں کی بنا پر ہے۔ ان میں سے ایک اس کی ترکیب لفظی میں پنہاں ہے۔ اگر اس لفظ سے کوئی حرف حذف بھی کردیا جائے، تب بھی بقیہ حروف ذات باری تعالیٰ کی نشاندہی کے لئے اپنا معنی برقرار رکھیں گے۔ مثلاً اللہ کا پہلا حرف (الف) حذف کرلیں تو للہ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے ''اللہ کے لئے'' اگر دوسرا حرف (لام) حذف کرلیں اور پہلی الف بحال رکھیں تو الہ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے معبود۔ اگر پہلے دونوں حروف (الف اور لام) حذف کرلیں تو لہ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے ''اس کے لئے'' اور اگر پہلے تینوں حروف حذف کرلئے جائیں تو ''ہ'' باقی رہ جائے گا۔ جو پھر اسی کی ذات کی نشاندہی کرتا ہے اور ''ھو'' (وہ) کے معنی میں بطور ضمیر استعمال ہوتا ہے۔ صوفیاء بالعموم اس کا ذکر کرواتے ہیں گویا ''اللہ'' ایک ایسا لفظ ہے جو من حیث الکل بھی اور اپنے ہر حرف اور جزو کے اعتبار سے بھی ذات حق پر معنوی دلالت کرتا ہے۔ اس نام کی ترکیب لفظی کے حسن کا یہ عالم ہے کہ اس کا کوئی حرف یا کوئی حصہ بھی بے معنی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ لفظ بھی ذات باری تعالیٰ کی طرح ہر ہر اعتبار سے کامل ہے۔ کسی اسم کی اپنے مسمیٰ پر اس سے زیادہ سے دلالت کا اور کیا تصور ہو سکتا ہے۔

لفظ اللہ کی اصل اور اس کا اشتقاق

اکثر علماء و محققین کی رائے یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' اسم مشتق ہے۔ اس لحاظ سے اس کے متعدد مادے â(Origins بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مشتق منہ معنوی طور پر ذات باری تعالیٰ مختلف شانوں اور حیثیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عام طور پر اہل علم یہ تصور کرتے

ہیں کہ اس لفظ کی اصل ''الٰہ'' ہے جس کا معنی ''معبود'' ہے۔ جو ''ال'' کے اضافے سے معرف ہو کر ''اللہ'' قرار پا گیا۔ ''لام تعریف'' کے بارے میں عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی اسم کو معرف باللام کر دیا جائے (یعنی اس کے آغاز میں ''ال'' کا اضافہ کر دیا جائے) تو وہ اسم اپنے استعمال اور اطلاق میں خاص ہو جاتا ہے۔ مثلاً کتاب کا لفظ عام ہے۔ کسی بھی کتاب پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگر اسے الکتاب کر دیا جائے تو اس کا اطلاق صرف کسی مخصوص کتاب پر ہو گا۔ ہر ایک پر نہیں۔ اسی طرح الٰہ کو معرف کر کے اللہ بنانے میں یہی مصلحت تھی کہ الوہیت صرف ذات حق سے مختص تصور کی جائے اور پوری کائنات میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہستی الٰہ کہلانے کی مستحق نہ رہے۔ یہی مفہوم کلمہ توحید کے پہلے حصے کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ **لا اله الا الله** (کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے) اگر باری تعالیٰ کو صرف الٰہ کہہ کر ہی پکارا جاتا تو اس سے اس کی شان الوہیت اور شان معبودیت تو آشکار ہوتی لیکن معبودان باطلہ کی نفی نہ ہو سکتی۔ گویا صرف ''اثبات'' ہوتا' نفی کا بیان نہ ہوتا۔ اس طرح یہ اسم جامع ضرور تصور کیا جاتا لیکن مانع نہ ہوتا اور اسم باری تعالیٰ کی انفرادیت و موزونیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ جامع بھی ہو اور مانع بھی۔

چنانچہ اس حکیم و خبیر نے اپنی ذات کی دلالت کے لئے ایسے لفظ کو منتخب فرمایا جو بیک وقت اس کے لئے الوہیت کا اثبات اور اس کے ماسوی کے لئے الوہیت کی نفی کر رہا ہے' یہاں نفی و اثبات کا اجتماع اس پہلو کو بھی اجاگر کر دیتا ہے کہ اسلام صرف حق کے اثبات کا ہی نہیں بلکہ ہر باطل کی نفی کا بھی نام ہے اور یہی تصور دراصل اسلام کے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے۔ لفظ اللہ کی اصل کے بارے میں امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔

اصله اله فحذفت همزته وادخل عليه الالف واللام فخص بالباری تعالی	اس کی اصل الٰہ ہے۔ جس کے ہمزہ (ء) کو حذف کر دیا گیا اور اس پر ال داخل کر کے اسے ذات باری کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔

(المفردات: ۲۱ مطبوعہ آرام باغ کراچی)

(ا) پہلا مادہ اشتقاق ......الٰہ (عبادت کرنا)

اس لفظ کے کئی مادے بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لغوی اشتقاق کے سلسلہ میں علماء کا ایک قول یہ ہے کہ یہ 'الٰہ' یالہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی عبادت کرنا ہے۔ اس طرح الٰہ کا معنی معبود (جس کی عبادت کی جائے) قرار پایا۔ زمانہ قدیم میں سورج کی پرستش کرنے والوں نے سورج کا نام الھہ رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے معبود تصور کرتے تھے۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔ کہ لفظ الہ معبود سے عبارت نہیں بلکہ اس کی دلالت اس وجود یا ہستی پر ہوتی ہے جو خود معبود ہونے کی اہل اور مستحق ہو۔ قرآن حکیم میں لفظ الہ اکثر و بیشتر معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِذْ قَالَ لِبَنِیۡهِ مَاتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ط قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ O (البقرہ،۲: ۱۳۳)	جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے، اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے O

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ اَ فَلَاتَتَّقُوۡنَ O (الاعراف،۷: ۶۵)	کہا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے؟

اسی مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ جن سے الٰہ کا معنی ''معبودؔ'' متحقق ہوتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنَ O (الانبیاء،۲۱: ۲۵)	اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری (ہی) عبادت کیا کرو O

اس مادہ اشتقاق کی بنا پر لفظ اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ اکیلی ذات جو مستحق عبادت ہے۔ جو اپنے وجود و کمال میں اس قدر جامع اکمل اور اتم ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کے لئے پرستش کے لائق ہے۔ جو خود واجب ہے اور باقی سب ممکن، جو خود خالق ہے اور باقی سب مخلوق، جو خود مالک ہے اور باقی سب مملوک، جو خود باقی ہے اور باقی سب فانی، جو خود قدیم ہے اور باقی سب حادث، جو خود غنی ہے اور باقی سب محتاج، جو خود ہی ازلی و ابدی ہے، اول و آخر ہے اور ظاہر و باطن ہے اور جو کچھ اس کائنات کے نقطہ آغاز سے لے کر نقطہ انجام تک وجود میں آ رہا ہے اسی کے فیضان ربوبیت کا پرتو ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال پانے میں اس کی محتاج ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں۔ کیونکہ جو محتاج ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ اخلاص میں تمام صفات الوہیت کے بیان کو اس طرح جمع کیا گیا کہ وہ سورت لفظ اللہ کی مکمل تعریف بن گئی، ملاحظہ ہو۔

الصَّمَدُO لَمْ يُوْلَدْO وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌO	آپ فرما دیں وہ اللہ ہے (جو) اَلْکُلُّ ہے۔ اللہ بے نیاز وَلَمْ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کا کوئی جوڑ ہے۔
(الاخلاص ۱۱۲: ۱۔۴)	

(۲) دوسرا مادہ اشتقاق......الہ (تحیر و درماندگی)

لفظ اللہ کے اشتقاق میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ الٰہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی تحیر و درماندگی ہے۔ رب ذوالجلال کے لئے اس لفظ کا اسم قرار پا جانا اس کی عظمت اور علو مرتبت کی صحیح نشاندہی ہے۔ کیونکہ انسان ذات باری تعالیٰ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور فہم وادراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور کرے گا۔ اس کی حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ معرفت الٰہی کی ابتدا بھی عجز و حیرت تھی اور انتہا بھی عجز و حیرت ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من

حواس انسانی ذات حق کا ادراک نہیں کر سکتے۔ عقل انسانی اس کے فہم سے قاصر ہے۔ کشف و وجدان اس کی کامل معرفت سے عاجز ہیں۔ انسان جب اپنی تمام ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور نفسی استعدادوں کو بروئے کار لا کر بھی اس حسن مطلق کے جلووں کا صحیح نظارہ نہیں کر سکتا اور اس حقیقت ابدی کو اپنے دامن عقل و فہم میں سمو نہیں سکتا تو اس کی زبان بے ساختہ پکار اٹھتی ہے۔

مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ	ازل! ہم تجھے اس طرح نہیں جان سکے جیسے تجھے جاننے کا حق تھا)

اس لئے کہ وہ کل ہے اور باقی سب جزو۔ وہ خود محیط ہے اور باقی سب محاط۔ وہ غیر محدود ہے اور باقی سب محدود۔ اس کی حقیقت سب جاننے والوں کی سرحد ادراک سے ماوراء ہے اور اس کی ہستی سب دیکھنے والوں کی منتہائے نظر سے بلند و بالا ہے۔

لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُO	نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہےo
(الانعام ۶: ۱۰۳)	

اسی وجہ سے حکم دیا گیا۔

تَفَکَّرُوْا فِیْ اٰلآءِ اللّٰہِ وَلَا تفکّرُوْا فِیْ اللّٰہِ

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرو اور ذات باری تعالیٰ میں غوروفکر نہ کرو۔

(الدر المنثور‘ ۲:۱۱۰)

قرآن حکیم میں جابجا آیات اللہ (خدا کی نشانیوں) میں غوروفکر اور تعقل وتدبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ ذات ایزدی میں تفکر کے لئے نہیں کہا گیا‘ ارشاد ہوتا ہے۔

مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذَالِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَO اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰواتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَتَّقُوْنَO

(یونس‘ ۱۰:۵۔۶)

اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا فرمایا مگر درست تدبیر کے ساتھ‘ وہ (ان کائناتی حقیقتوں کے ذریعے اپنی خالقیت‘ وحدانیت اور قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے واضح فرماتا ہے جو علم رکھتے ہیں بے شک رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور ان (جملہ) چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمائی ہیں (اسی طرح) ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو تقویٰ رکھتے ہیںo

دوسرے مقام پر اسی طرح ارشاد فرمایا۔

سَنُرِیْھِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ۔

(حم سجدہ‘ ۴۱:۵۳)

ہم انھیں جلد ہی کائنات میں اور ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھادیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

اَوَ لَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ۔

(الروم‘ ۳۰:۸)

کیا وہ اپنے نفوس میں تفکر نہیں کرتے۔

تفکر فی آیات اللہ کی تلقین دیگر مقامات پر اس طرح کی گئی ہے۔

کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَO

(البقرۃ‘ ۲:۲۱۹)

اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتے ہے تاکہ تم غور وفکر کروo

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِO

(آل عمران، ۳:۱۹۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلوؤں) میں فکر کرتے رہتے ہیں (پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لےO

متذکرہ بالا آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ عالم کون و مکان میں کارفرما قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر سے ہستی باری تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے اور اس کی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔ جوں جوں انسان انفس و آفاق کی آیات و علامات کے فکر میں منہمک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پر ذات حق کی عظمتیں اور سطوتیں مزید آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ تحیر و استعجاب کے سمندر میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک معرفت کی منزلوں میں اس ''مقام حیرت'' کو نہایت بلند درجہ حاصل ہے تاریخ شاہد ہے کہ کئی عرفاء طویل طویل مدت تک آیات الٰہیہ میں غور و فکر کرتے ہوئے مقام حیرت میں اس طرح گم کھڑے رہے کہ اس محویت میں نہ انھیں اپنی خبر رہی نہ دنیا کی۔ حتی کہ یہی حیرت منتہائے معرفت قرار پا گئی۔ لیکن اس درجہ تک بھی عقل کو نہیں عشق و محبت ہی کو رسائی حاصل ہوتی ہے۔ بقول اقبال

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردہ محمل گرفت

اسی لیے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

دنیا کے تمام عرفاء اور حکماء اس امر پر متفق رہے ہیں کہ آگہی کی انتہا بے خبری ہے اور علم کا آخری نقطہ کمال لاعلمی ہے۔ جب چشم علم و معرفت پر تمام حجابات کے اٹھ جانے سے حقیقت

ابدی منکشف ہوجاتی ہے اور عارف ذات حق کی معرفت کے لیے قدم آگے بڑھاتا ہے تو اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اس لاعلمی کا علم ہی اس کے لئے سب سے بڑا علم قرار پاجاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

بس بارگہ الوہیت میں یہی انسانی علم کی انتہاء ہے کہ انسان کو اس کے ہونے اور اپنے نہ ہونے کی خبر ہوجائے۔ کسی نے اس مقام معرفت کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اکبر نے حیرت و درماندگی اور تحیر و بے خبری کو منتہائے علم تصور کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ

ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا

بلھے شاہؒ فرماتے ہیں۔

''علموں بس کریں اویار''

اس لیے اس ذات بلند و برتر نے اپنا نام اللہ منتخب فرمایا تا کہ انسان پر یہ حقیقت واشگاف ہوجائے کہ وہ اس ہستی مطلق کی عظمتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اسی کو امام رازیؒ یوں بیان کرتے ہیں۔

فَھٰھُنَا الْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ

پس اس مقام پر حصول ادراک میں عجز و ناکامی کا نام ہی ادرک ہے۔

(قول صدیق اکبرؓ)

(۳) تیسرا مادہ اشتقاق ......الٰہ (سکون پانا)

اس بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ ''اللہ'' ''الٰہ'' سے مشتق ہے۔ جس کا معنی سکون پانا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ الھت الی فلان ای سکنت الیه (کہ میں نے فلاں سے سکون پایا) ذات باری تعالیٰ کو ''اللہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ بیتاب دلوں کو اسی سے تسکین ملتی ہے' قران حکیم میں مذکور ہے۔

اَلا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنَ الْقُلُوْبO
(الرعد' ۱۳:۲۸)

جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہےO

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَاللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَO

(الانفال ۸:۲)

ایمان والے (تو) صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اس کی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلامِ محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) ان کے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں (اور کسی غیر کی طرف نہیں تکتے)o

اس آیت میں اہل ایمان کی حالت محبت بیان کی جارہی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں جو اپنا رشتہ محبت اس محبوب حقیقی سے استوار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ علامت محبت ہے کہ محبوب کا نام اور ذکر سن کر اہل محبت کے دلوں کو تسکین ملتی ہے، سب غم زیست بھول جاتے ہیں، دل اس کی یاد میں لذت وطمانیت اور کیف وسرور کی دولت پاتے ہیں۔ لیکن سورہ انفال کی آیت میں "وجلت قلوبھم" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں دل کے لرز جانے کا ذکر ہے۔ اہل دل سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہوگی کہ جب محبت شدت اختیار کر کے عشق کا روپ دھار لے تو دل پر عجیب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں۔ اس وارفتگی اور جنون کی حالت میں جب محبوب کا نام سننے میں آئے۔ کہیں اس کا تذکرہ ہو یا خود دل میں اس کی یاد زور پکڑ لے تو دل لرز لرز جاتا ہے۔ بعض اوقات کپکپی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم میں سے بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ عاشق اس کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے آنکھیں برسنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے اور یہی اس کے لیے باعث سکون بھی بنتی ہے۔ متنبّی محبوب کا ذکر سننے پر دل کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔

الیس وعدتنی یا قلب عنی
اذا ما تبت عن لیلی تتوب
فھا انا تائب عن حب لیلی
فما لک کلما ذکرت تذوب

(اے دل! کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب میں لیلیٰ کی محبت سے تائب ہو جاؤں گا تو تو بھی توبہ کر لے گا۔ پس دیکھ میں تو لیلیٰ کی محبت سے تائب ہو چکا ہوں۔ اب تجھے کیا ہوا ہے کہ جب بھی لیلیٰ یاد آتی ہے (یا اس کا

ذکر ہوتا ہے) تو تو پھر پگھلنا شروع کر دیتا ہے)

قرآن اہل ایمان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ جب باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو اہل ایمان کے دل پگھلنے لگتے ہیں۔ کیونکہ جوں جوں حب الٰہی عشق میں بدلتی جاتی ہے ایمان کمال کو پہنچتا ہے' جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ (البقرہ' ۲:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اسی ٹوٹ کر محبت کرنے کو ہی تو عشق کہتے ہیں اور اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق کو محبوب کے سوا نہ کسی اور کی طلب رہے اور نہ ضرورت۔ اسی بے نیازی کو قرآن "وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" کے الفاظ سے تعبیر کررہا ہے کہ اہل ایمان اپنے محبوب حقیقی کے علاوہ کسی اور کے لطف وکرم اور عنایت واحسان کی آرزو ہی نہیں کرتے۔ جب دنیا کی تمام متاع اور خیر کا منتہائے کمال سکون قلب ہی ہو اور یہ دولت انھیں دامن محبوب سے میسر آ جائے تو پھر انہیں کسی اور جانب نگاہ اٹھانے کی حاجت ہی کیوں ہو کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

چنانچہ لفظ اللہ ذات باری سے انسان کے محبت کرنے اور اسی سے سکون قلب پانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ پر الف لام کے واقع ہونے سے جو تعریف اور اختصاص پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ انسان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے کہ اس عالم آب وگل میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے حقیقی سکون کی دولت سے بہرہ ور کر سکے۔ گویا یہ نام پریشان حال لوگوں اور بے چین ومضطرب دلوں کو مژدہ جانفزا سنا رہا ہے کہ دنیا کی گونا گوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات اور دل و دماغ کی آسودگی وطمانیت دنیوی عیش وآرام کے سامانوں سے میسر نہیں آ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ دولت اور مادی وسائل و ذرائع سمیٹنے سے نصیب نہیں ہو سکتی' زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی ہوس نفس پرستی کے تحت محکوم اور غلام بنا لینے سے نہیں مل سکتی' بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے دامن لطف و عافیت سے وابستہ ہو کر نصیب ہو سکتی ہے۔ بیشک بیقرار دلوں کو اسی کی یاد میں قرار ملتا ہے اور غم حیات کے ستائے ہوئے انسانوں کو اسی سے لو لگانے میں سکون ملتا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ دنیا میں کتنے انسان ایسے ہیں جو تمام مالی آسائشوں اور رنگین سامانیوں کے باوجود سکون قلب سے محروم ہیں اور اسی دولت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اسی بنا پر وہ آئے دن متعدد امراض کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ خوش نصیب جنھوں نے تمام مادی دولتوں کے عوض ایک روحانی دولت یاد الٰہی کی صورت میں پالی ہے۔ کس

قدر مطمئن اور پر سکون رہتے ہیں۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے مصداق ہر پریشانی سے محفوظ ہیں۔ یادِ حق سے شغف وانہماک کتنی لذت، سکون، طمانیت اور کیف وسرور عطا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تو اسی کو ہو سکتا ہے جس نے شب کی تاریکیوں میں محبوب حقیقی کی خاطر اپنا پہلو بستر سے جدا رکھا ہو، جس نے نصف شب اور آخر شب عشق الٰہی میں بسمل کی طرح تڑپنے کا مزہ چکھا ہو، جس نے راتوں کی خلوت کو محبوب کی یاد اور اس کے ذکر وفکر سے جلوت میں بدل کے دیکھا ہو۔ جس نے اسے منانے کے لئے رو رو کر اپنا دامن آنسوؤں سے بھگویا ہو اور جس نے عشق کی آگ کو سرد آہوں سے بجھانا سیکھا ہو اسی کو اس سکون اور لذت کی خبر بھی ہو سکتی ہے اور قدر بھی۔ جس پر کیفیات کبھی بیتی ہی نہ ہوں اسے ایسے احوال کی کیا خبر۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص نہایت خوش ذائقہ پھل کھا کر اس کی وہ لذت اور شیرینی جو اسے کھانے میں محسوس ہوئی تھی ایسے شخص کو سمجھانے لگے جس نے کبھی وہ پھل چکھا تک نہ ہو۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہوگا۔ وہ شخص یقیناً اس لذت کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ جب تک کہ وہ خود اس پھل کو نہ کھا لے۔ لہٰذا اس سکون کو جو اللہ کی ذات سے لو لگانے میں میسر آتا ہے خود لو لگا کر محسوس تو کیا جا سکتا ہے دلائل سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسی سکون قلب کے حصول کے لئے تو اہل دل شب بھر یادِ حق میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا O	اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں o
(الفرقان، ۲۵: ۶۴)	

اور یہ وہ لوگ جو ساری رات اپنے رب کے لئے سجود و قیام میں گزار دیتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ O	اور وہ پچھلی رات (اٹھ اٹھ کر) استغفار کرتے ہیں o
(الذاریات، ۵۱: ۱۸)	

اس آیت میں اہل محبت کی دائمی حالت بیان کی جا رہی ہے کہ محبوب کو منانے کے لئے ہمیشہ پچھلی رات آہ وبکا کرتے ہیں۔ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتوں کی نیند اور سحر کا خمار انگیز وقت قربان کرتے ہیں۔ تب جا کر انھیں ''من کی دولت'' نصیب ہوتی ہے، اقبال نے بجا کہا ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

یہ سکون قلب یا من کی دولت ایسی دولت ہے جس پر نہ غربت اثر انداز ہوتی ہے نہ امارت، نہ سفر، نہ حضر، نہ بیماری، نہ صحت، نہ کمزوری، نہ طاقت، اس سے باطن میں ایک الگ دنیا آباد

ہوتی ہے۔ جس کی رونقوں میں انسان مگن رہتا ہے اور تمام دنیوی احوال اس کے لئے اضافی ہوتے ہیں اور اضافی کیفیات عاشق کی دنیا میں اپنا کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ اقبال نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے۔

تری دنیا جہان مرغ وماہی
مری دنیا فغان صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم ومجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی

(۴) چوتھا مادہ اشتقاق......الولہ (عقل کا گم ہونا)

دوسرے اور چوتھے مادوں میں معنوی یکسانیت ہے۔ دوسرا مادہ اشتقاق الہ تھا۔ جس کا معنی تحیر ودرماندگی بیان کیا گیا ہے اور ولہ میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مادوں کے اعتبار سے لفظ الٰہ اور اللہ کا معنی یہ قرار پایا کہ وہ ذات جس کی جستجو میں عقل وخرد گم ہوجائیں۔

عقل ہمیشہ سے اسی حقیقت ابدی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن آج تک بالیقین اسے پا نہ سکی۔ فلسفہ کا آغاز بھی اسی حقیقت یعنی منظور کو جاننے کی کوشش سے ہوا تھا۔ چنانچہ فلسفہ اپنے دور عقلیت میں حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ عقلیت سے مراد فلاسفہ یونان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ صرف عقل ہی ذریعہ علم حقیقت ہے۔ اس سے محسوسات کے حقیقت ہونے کا انکار لازم آیا اور حقیقت کو صرف معقولات سے مختص کردیا گیا۔ لیکن جو ذات عقل کے حیطہ ادراک سے ماوراتھی، حقیقت قرار نہ پاسکی اور بالاخر فلاسفہ اس تصور علم سے تائب ہوگئے۔ اس کے بعد فلسفے کے دور حقیقت کا آغاز ہوا۔ جس میں صرف حواس کو ہی ذریعہ علم حقیقت مانا گیا۔ اس طرح محسوسات حقیقت قرار پاگئے اور معقولات کے حقیقت ہونے کا انکار ہوگیا۔ لیکن جو وجود حواس کے حیطہ ادراک سے ماورا تھا حقیقت قرار نہ پاسکا۔ عقل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں وپریشان پھرتی رہی۔ بالاخر ''تشکیک اور سوفسطائیت'' کی نذر ہوگئی۔ فلاسفہ اور عقلاء کے پاس عقل کو اس بھنور سے نکالنے سے نکالنے کوئی تدبیر نہ تھی اور نہ حقیقت کو پانے کا کوئی حتمی لائحہ عمل تھا چنانچہ انھوں نے اپنی تلاش وجستجو کا رخ ہی پھیر لیا۔ انھوں نے توجہ منظور (جسے دیکھا جارہا ہو) کی بجائے ناظر (خود دیکھنے والا) کی طرف کرلی۔ اور عقل کی بجائے ''اسے'' تلاش کرنے کے ''اپنی'' ہی تلاش میں مگن کرلیا۔ فلاسفہ کے انداز فکر اور سمت جستجو میں یہ تبدیلی دراصل اس حقیقت کا اعلان تھا کہ ''عقل حقیقت ابدی کو نہیں پاسکتی'' عقل کے سفر میں اتنے مراحل اس لیے آئے کہ وہ اقدام وخطا Trial (and) Error کے طریق پر گامزن تھی۔ اگر وہ شروع سے آستان مذہب پر سر تسلیم خم کرلیتی تو اسے اتنے جتن نہ کرنے پڑتے۔ کیونکہ مذہب تو اس حقیقت کو اللہ کا نام دے کر پہلے دن سے یہ پکار رہا تھا کہ اس ذات کا ادراک حواس وعقل کی پرواز سے بلند ہے۔ اگر عقل اس کی تلاش میں نکلے گی تو خود گم ہوجائے گی۔

عقل کو بالاخر اعلان الوہیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اب عقل کا خود ناظر کی تلاش میں مصروف ہو جانا دراصل ''معرفت نفس'' کی سعی ہے اور یہ سعی ''ذریعہ وجدان'' کے بغیر ممکن نہیں۔ تلاش کے لئے دو تو عالم تھے۔ عالم آفاق اور عالم انفس جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

سَنُرِيهِمُ ایاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیٓ اَنْفُسِهِمْ۔ ہم تمھیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق کے دونوں عالموں میں دکھا دیں گے۔

(حم سجدہ ۴۱: ۵۳)

عالم آفاق میں حواس اور عقل کی کاوشیں کارگر ہوسکتی تھیں وہ اپنی جدوجہد کر چکیں۔ انہیں حقیقت کا سراغ بھی ملا لیکن اسے پا نہ سکیں، مگر عالم انفس میں معرفت نفس کی کاوش میں حواس اور عقل سے کہیں زیادہ وجدان کی ضرورت ہے۔ اس نہج پر بھی حقیقت کا احاطہ تو ممکن نہیں لیکن اس کی کچھ نہ کچھ معرفت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ **''من عرف نفسه فقد عرف ربه''** کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ اقبالؒ تلاش حقیقت کے لیے صحیح سمت کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیدا ست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

چنانچہ لفظ اللہ جس واجب الوجود کی ذات والا صفات پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی براہ راست معرفت عقل انسانی کے بس میں نہیں بلکہ یہ اس کے مظاہر سے ممکن ہے اور حقیقت انسانی خود اس ہستی مطلق کی سب سے کامل مظہر ہے۔ اس لئے اقبالؒ ایک اور مقام پر لکھتا ہے۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری زخود گیری زبر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

اسی تصور کو ایک اور انداز میں یوں واضح کیا گیا ہے۔

چیست دیں؟ در یافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش
برمقام خود رسیدن زندگی ست
ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست

معرفت ذات حق کی راہ پانا عقل سے نہیں ذوق و وجدان سے ممکن ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

عقل تو خود ہی اس راہ میں دم بخود ہے اور اس حقیقت کی تلاش میں عقل مادی کا سہارا لینے والے بھی گم گشتہ راہیں۔ عقل کی بے سروسامانی اور عشق کی شناسائی منزل راہ نوردوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے

بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری

(۵) پانچواں مادہ اشتقاق ......لاۃ (بلندی وارتفاع)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ الٰہ اور اللہ کا مشتق منہ 'لاۃ' ہے۔ جس کا معنی ''بلند ہونا'' ہے۔ چنانچہ اس لفظ کی معنوی دلالت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو ہر عجز اور کمزوری سے بلند ہو' جو ہر نقص اور حرمان سے بلند ہو۔ جو ہر عیب وخطا سے بلند ہو۔ جو ہر ضرورت واحتیاج سے بلند ہو۔ جو ہر مناسبت ومماثلت سے بلند ہو۔ جو ہر ایک کے کفر وشرک سے بلند ہو۔ جو انسانوں کے ظلم و معصیت سے بلند ہو جو انسانی وہم وگمان سے بلند ہو۔ جو ممکنات ومحدثات سے بلند ہو۔ جو ہر مخلوق کی قوت ادراک سے بلند ہو۔ اور جو ہر ایک کی طاقت توصیف سے بھی بلند ہو' اسی لئے ارشاد فرمایا گیا۔

سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ O (الانعام' ٦:١٠١)	وہ ان (تمام باتوں سے پاک اور بلند وبالا ہے جو یہ (اس سے متعلق) کرتے پھرتے ہیں O

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ O (الصافات' ٣٧:١٨٠)	تیرا رب جو عزت والا رب ہے ان کی باتوں سے پاک اور بلند ہے O

امام رازیؒ باری تعالیٰ کی مطلق بلندی وبرتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان الواجب لذاته ليس الا هو' والكامل لذاته ليس الا هو' والاحد الحق فى هويته ليس الا هو' والموجد لكل ماسواه ليس الا هو (التفسیر الکبیر)

ارتفاع عام طور پر ایک اضافی امر تصور کیا جاتا ہے جس کا تعلق مکان سے ہوتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات مکان اور اضافت مکانی سے بھی بلند وبالا ہے۔ اس لئے اس عالم کو جہاں اس کے انوار ذات کا جلوہ عیاں ہے۔ اصطلاح میں عالم لامکان کہتے ہیں۔ لامکاں کو عالم کہنا بھی مجاز ہے ورنہ اس کی ذات اس سے بھی بلند ہے کیونکہ اس کا ارشاد تو یہ ہے۔

انا مكون المكان وليس لى مكان سوى الانسان (الرسالۃ غوث اعظمؒ)	میں مکان کو پیدا کرنے والا ہوں اور سوائے انسان کے میرا کوئی مکان نہیں ہے۔

اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا۔

لایسعنی ارضی و لاسمائی و لکن یسعنی قلب عبدی المومن (الحدیث)

مجھے زمین اور آسمان کی وسعتیں اپنے اندر نہیں سموسکتیں لیکن میں اپنے بندہ مومن کے دل میں سماجاتا ہوں۔

اس لئے وہ ذات مکان اور سمت و جہت کے تعینات کے بغیر ہر شے سے بلند ہے۔ لیکن اس کی بلندی کائنات کی تمام جہتوں میں اس کے ظہور کو بھی مانع نہیں ہے۔ بناء بریں ارشاد قرآنی ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ (البقرہ، ۲:۱۱۵)

پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔

(۶) چھٹا مادہ اشتقاق ...... ''لاہ یلوہ'' (مخفی ہونا)

اس اعتبار سے الٰہ اور اللہ کا اطلاق اس ذات اقدس پر ہوتا ہے جو ہر آنکھ سے پنہاں ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌO (الحدید، ۵۷:۳)

وہی اول ہے وہی آخر، وہی عیاں ہے وہی نہاں اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہےO

گویا وہی ذات عیاں بھی ہے اور نہاں بھی۔ ظہور و احتجاب (اجاگر ہونا اور مخفی ہونا) دونوں شانوں کا بیک وقت ایک ہی ذات میں موجود ہونا اس طرح ممکن ہے کہ

(ا) صفات سے عیاں ذات سے نہاں

وہ جلوہ حسن اپنی صفات کے اعتبار سے عیاں ہو مگر ذات کے اعتبار سے نہاں، گویا کائنات میں ہر سو اس کی صفات و کمالات ربوبیت کا جلوہ ظہور پذیر ہو۔ اس کی بے پایاں رحمتیں اور نشانیاں اظہر من الشمس ہوں جو قدم قدم پر انسان کو اس کے ہونے کا یقین دلا رہی ہوں۔ لیکن جب انسان اس کی ذات کا بے حجاب دیدار کرنا چاہے تو وہ مستور و محجوب رہے۔ یعنی اس کی صفات ظاہر ہوں اور ذات باطن جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ (الانعام، ۶:۱۰۳)

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۲) شدت ظہور کے باعث آنکھوں سے نہاں

احتجاج ظہور و بطون کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ذات اس قدر ظاہر ہو کہ دکھائی نہ دے سکے گویا وہ شدت ظہور کی بناء پر آنکھوں سے مخفی رہے۔ اس ضمن میں امام رازی فرماتے ہیں۔

المحققین: سبحان من احتجب عن العقول بشدة ظهوره واختفى عنها بكمال نوره۔ (تفسیر کبیر)

بعض محققین کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جو اپنی شدت ظہور کے باعث عقلوں سے محجوب ہے اور کمال نور کے باعث ان سے مخفی ہے۔

جیسے سخت گرمی کے موسم میں عین نصف النہار کے وقت سورج کو اس کی شدت ظہور کے سبب سے براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس طرح وہ عیاں ہو کر بھی نہاں رہتا ہے لیکن آفتاب کو اس نور حق کے ظہور تام سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ جس کا بیان اللہ نور السموات والارض کے لفظوں میں کیا گیا ہو اور واشرقت الارض بنور ربھا کا اعلان جسکی جلوہ تابانیوں پر دلالت کرتا ہو۔ چنانچہ وہ ذات اپنے نور ذاتی اور نور صفاتی کے ساتھ اس قدر ظاہر، عیاں اور تاباں ہے کہ کوئی آنکھ اس کے جلوے کی تاب نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ ظاہر ہو کر بھی مخفی رہتی ہے۔

(۳) انتہاء قرب کے باعث نظروں سے نہاں

ذات باری کے مخفی ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ قابل ادراک نہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ درمیان میں مناسب فاصلہ ہو۔ اگر ناظر و منظور دونوں میں اتنا قرب ہو کہ نقطہ بھر بھی فاصلہ اور دوری باقی نہ رہے تو منظور مخفی ہی رہتا ہے اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ جیسے پتلی آنکھ کے اندر ہو کر بھی آنکھ سے مخفی ہے۔ اسی طرح ذات حق انسان کے باطن میں سما کر بھی اس سے مخفی رہتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ (البقرہ، ۲:۱۸۶)

(اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو (بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں۔

ایک اور مقام پر اس قرب کی نوعیت بھی بیان کی گئی ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِO (ق، ۵۰:۱۶)

اور ہم اس سے دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیںO

اس آیت میں بھی قرب کو مبالغے کے صیغے سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن قرب کی حد متعین نہیں کی گئی جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنے بندے سے اتنی قریب ہے کہ اس کا

اندازہ بھی ممکن نہیں۔ گویا ذات حق سارے جہان اور اہل جہان کی جان ہے اس لئے بدن اسے دیکھنے سے قاصر ہیں' بقول شخصے

حق جان جہان است وجہاں جملہ بدن
توحید ہمیں است دگر حیلہ وفن

حضرت رومیؒ جان وتن کے قرب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سر من از نالہ من دور نیست
لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جان زتن مستور نیست
لیک کس را دید جاں دستور نیست

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں۔

محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مرز با نرا مشتری چوں گوش نیست

حقیقت یہی ہے کہ قرب الٰہی کا یہ ہوش پوری دنیا و مافیہا سے بے ہوش ہوئے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا

چوں ایں جا بے خودی می آورد ہوش
عبارت را اشارت گفت خاموش

(۴) خود مخفی مگر اپنی تصرف قدرت کو ظاہر کرنے والی

ذات حق کے ظاہر اور باطن ہونے کا معنی یہ بھی ہے کہ وہ ذات خود مخفی ہے لیکن ہر شے میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اس کی مثال روح کی سی ہے جو خود مخفی رہتی ہے مگر اپنے تصرفات کو جسم کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ جسم درحقیقت مردہ و بے جان ہوتا ہے لیکن روح کا محکوم۔لوگوں کی نظر میں جسم کی حرکات عیاں ہوتی ہیں اور وہ روح جو اصل محرک ہے نہاں ہوتی ہے۔ گویا روح کی حیثیت ''ہست نیست نما'' کی ہوتی ہے کہ خود حقیقت میں متصرف ہے لہذا ''ہست'' ہے اور حرکت جسم جو اصلاً نیست تھی روح کی وجہ سے ہست نظر آنے لگی۔ اسی طرح گرد باد میں ہوا اصل محرک ہوتی ہے لیکن خاکی ذرات تیز رفتاری کے ساتھ گول چکر میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا مخفی اور محجوب رہتی ہے اور ذرات ظاہر وعیاں۔ لوگوں کی نگاہیں ذرات کی حرکت پر پڑتی ہیں لیکن ہر ہر ذرے کے پیچھے کارفرما قوت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت ہست تو وہ صاف ہوا تھی جس نے تحریک کے ذریعے ذرات خاک کی حرکت کو نیست سے ہست بنادیا۔ اس طرح وہ قادر مطلق جو قیوم عالم ہے وہی ہست ہے لیکن نیست نما ہے جس نے اپنے تصرف سے موجودات عالم کو متحرک بنادیا ہے وہ خود تو مخفی ہے لیکن اس کا تصرف کائنات کے ذرے ذرے

میں ظاہر و باہر ہے۔ ورنہ اس کے بغیر ہر چیز نیست و معدوم تھی۔ اس قرآنی ارشاد کا یہی معنی ہے۔

كُلُّ شَيْئٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ سوائے اس کے ہر ہست، نیست ہے۔
(القصص، ۲۸:۸۸)

چونکہ ہر شے اسی کی ہستی سے قائم ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔
(الحدید، ۵۷:۴)

لہذا اللہ کا لفظ ان معنوں میں اس ذات کے مخفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

(۷) ساتواں مادہ اشتقاق ...... الہ (جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا)

اس اعتبار سے الہ کا معنی ہوا جس کی طرف جھکا جائے اور رجوع کیا جائے۔ اور اللہ کا معنی لام تعریف کے باعث یہ طے پایا کہ وہی ایک ذات ہے جس کی طرف جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا فطری اور لابدی امر ہے گویا "اللہ" کے کلمات اس حقیقت کا کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ اسے انسان تو چاہے جتنا سرکش و باغی بن جا۔ اپنے رب کی اطاعت وغلامی سے جتنا بھی منہ موڑ لے۔ سرکش و باغی شخص بھی بالآخر اسی کی طرف جھکتا ہے، اس کی ذات سے دل کا علاقہ جس قدر چاہے منقطع کر لے لیکن جب بھی تجھ پر آفت و مصیبت کی گھڑی آئے گی ساری دنیا کے اسباب و ذرائع سے تو کلیتہً مایوس ہو جائے گا اور کسی چیز پر بھی تیری کوئی امید باقی نہ رہے گی تو اس وقت تیرا دل عاجزی اور شکستگی کے ساتھ بے اختیار ذات باری تعالیٰ کی طرف جھک جائے گا تو اسے والہانہ رغبت اور رجوع کے ساتھ پکار اٹھے گا کہ اے اللہ مجھے بچا لے اور میرے حال پر رحم فرما تیرے لاشعور کی یہ دبی ہوئی آواز بلند ہو جائے گی۔ جب سب امیدیں ٹوٹ جائیں اور صرف ایک ہی امید باقی رہ جائے تو وہ امید "اللہ تعالیٰ" کی ذات رحیم و کریم کی ہوتی ہے اس وقت ہر انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ موحد ہو مشرک، مومن ہو یا کافر ملحد بلا استثناء اسی ذات کو پکارتا ہے اور دل اس کے سوا کسی اور جانب جھکنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ طبعی وفطری حقیقت ہر صورت میں رونما ہو کر رہتی ہے۔ خواہ بندہ اسے کوئی بھی نام دے دے۔ اس ہستی کو خدا کہے یا کوئی اور ماورائی طاقت لیکن اس کا دل کسی عظیم ہستی کے تصور سے پسیجتا ضرور ہے۔ بس یہی ذات وحدہ لاشریک ہے اور اسی کا نام "اللہ" ہے۔

(۷) لفظ اللہ کا معنی اور لفظ انسان کا معنی

مزید برآں جب "اللہ" کے لفظ میں اس کی طرف راغب ہونے کا معنی موجود ہے تو اس کے بالمقابل انسان ہی سب سے زیادہ مستحق ہستی ہے جو اس کی طرف سب سے بڑھ کر

راغب اور مانوس ہو۔ کیونکہ لفظ ''انسان'' بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ ''انسان'' کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ''اُنس'' سے ماخوذ ہے اور دوسرے یہ کہ ''نسیان'' سے۔ پہلے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا ''مانوس ہونے والا'' جب کہ دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا ''بھولنے والا۔'' ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ انس سبب ہے اور نسیان اس کا نتیجہ۔ جب انسان کسی سے مانوس ہوتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ محبوب کے ماسوا کو بھولتا جاتا ہے جب انس و محبت کمال کو پہنچتے ہیں تو وہ محبوب کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی بھی ہوش اور خبر باقی نہیں رہتی۔

ذاکر ہمہ ذکر و ذکر مذکور شود

گویا یہی نسیان اس کے انس کے کامل ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ اب ایک طرف اللہ جلوہ حسن کے طور پر موجود ہے اور دوسری طرف ''انسان'' اس کی جانب راغب اور مانوس ہونے کے لئے۔ چنانچہ وہ ذات جس کی طرف محبت کرنے والے دل جھکتے اور راغب ہوتے ہیں ذات باری ہے۔ اور جو افراد اس حسن ازل کی محبت میں گرفتار ہیں ''کامل انسان'' ہیں یہی پیغام محبت لفظ اللہ کے ذریعے بنی نوع انسان کو دیا جا رہا ہے کہ اے افراد نوع انسانی! زوال پزیر حسن کے جلووں سے دل لگانے کی بجائے اس لازوال حسن کے گرویدہ ہو جاؤ۔ اسی کی طرف لپکو اور اسی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھو کیونکہ اس کی محبت میں جو موت آئے گی وہ حیات ابدی کا پیش خیمہ ہو گی۔

(۸) آٹھواں مادہ اشتقاق ......اَلَہَ (پناہ دینا)

اس مادے کے اعتبار سے لفظ ''اللہ'' اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہی وہ ذات ہے جو ہر ایک کو پناہ دینے والی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ۔ اور جو پناہ دیتا ہے اور جس کے خلاف (کوئی) پناہ نہیں دی جا سکتی۔ (المومنون' ۲۳:۸۸)

پناہ دینا مصیبت زدہ افراد کے لئے سب سے بڑی نعمت اور عطا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جتنی بھی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں وہ فی الحقیقت انسان کا اپنا کسب نہیں ہیں۔ آنکھوں کی بصارت ہو یا کانوں کی سماعت' زبان کا ذائقہ ہو یا ہاتھ پاؤں کی حرکت۔ دماغ کی فکری قوت ہو یا طبعی و نفسانی لذات۔ الغرض حیات دنیوی کی تمام نعمتیں اگر اللہ تعالیٰ عطا نہ کرے تو پیدائش سے لے کر تا دم مرگ انسان کسی وقت بھی ان کے حصول پر قادر نہیں ہو سکتا۔ جب خود زندگی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دین ہے تو اس کے لوازمات و انعامات اس کی عطا کیوں نہ ہوں' قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَابِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰه۔
(النحل ۱۶: ۵۳)

اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے سو وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔
(الانعام ۶: ۱۴)

اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور (خود اسے) کھلایا نہیں جاتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔
(النساء ۴: ۷۸)

آپ فرما دیں (حقیقتاً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے۔

چنانچہ لفظ ''اللہ'' کی معنوی افادیت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرے لیکن خود کچھ نہ لے۔ اسی لئے وہ خود کو الصمد (بے نیاز) کہتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے عبادت کا طلب گار ہے۔ نہیں نہیں۔ عبادت اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجرت ومعاوضہ بلکہ چونکہ عبادت دراصل خشوع وخضوع تذلل انکساری اور عاجزی کی انتہائی صورت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو سائل بننے کا سلیقہ سکھاتے ہیں تاکہ اس کی بارگاہ صمدیت سے کچھ مانگنے کا ڈھنگ آ جائے اور وہ ذات اپنے بندے کی عاجزی دیکھ کر اسے مزید لطف وکرم سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ کا علی الاطلاق مجیر و معطی ہونا۔ اس حدیث صحیح سے کتنا واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَ اللّٰهُ يُعْطِی
(متفق علیہ)

بے شک تقسیم میں ہی کرتا ہوں لیکن عطا اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔

گویا انبیاء کرام بھی روئے زمین پر باری تعالیٰ ہی کی نعمتوں اور عطاؤں کو تقسیم کرنے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ متذکرہ بالا تمام معانی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ذات باری تعالیٰ کی کامل دلالت کے لئے اللہ سے بہتر کوئی اور نام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے تسمیہ میں اسی نام سے آغاز کیا گیا۔

www.MinhajBooks.com

باب ۵

اَلرَّحمٰن الرَّحِیم کے تفسیری معارف

www.MinhajBooks.com

تسمیہ میں ذات باری تعالیٰ کا ذکر اولاً لفظ اللہ سے کیا گیا ہے اور اس کے بعد اسی اسم ذات کو مزید دو صفات ''الرحمٰن الرحیم'' سے متصف کر دیا گیا ہے۔ جس سے آیت تسمیہ کا معنی یہ قرار پایا۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں' جو نہایت مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے۔ اب ان دو صفات باری کا معنی و مفہوم پیش خدمت ہے۔

الرحمٰن کے لغوی اور اصطلاحی معانی

یہ دونوں اسم' مبالغے کے صیغے پر ''رحمت'' سے مشتق ہیں۔ لیکن ''رحمٰن'' فعلان کے وزن پر زیادہ مبالغے پر مبنی عربی قواعد کی رو سے ''فعلان'' ایسا اسم مصدر ہے جس میں فعل کی انتہائی کثرت اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جو اسماء اس وزن پر ہوں گے ان میں معنویت' انتہائی کثرت' فراوانی اور مبالغے کے ساتھ موجود ہوگی۔ یعنی ان کے مادوں کا مفہوم ان اسماء میں نہایت شدت اور زیادتی کے ساتھ پایا جائے گا۔ مثلاً فرقان' اس میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کی صفت اپنے منتہائے کمال پر موجود ہے۔ یہ قرآن کا نام ہے اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی کتاب حق و باطل میں واضح فرق پیدا نہیں کر سکتی۔ قربان' اس میں قرب کا معنی انتہائی افراط کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔ ندمان' اس میں نادم اور شرمندہ ہونے کا معنی پایا جاتا ہے' لیکن اسم میں یہ صفت اس قدر شدت کے ساتھ موجود ہے کہ کوئی اور لفظ اس سے زیادہ معنی ندامت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح غضبان ہے اس میں بھی غیض و غضب کا معنی انتہائی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس اسم سے بڑھ کر غضبناک ہونے کا مفہوم کوئی اور وزن ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ الرحمٰن بھی اسی وزن پر ''رحم'' سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی صاف طور پر یہ متعین ہوا کہ ''انتہائی مہربانی فرمانے والا۔'' گویا لفظ رحمٰن میں صفت رحمت کی اتنی کثرت' فراوانی اور غایت و نہایت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی اور کا رحیم ہونا متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

الرحمٰن کی اسمی خصوصیت

صفت رحمت تو مخلوقات میں سے بھی لاکھوں افراد میں موجود ہے۔ لیکن یہ لفظ رحمٰن کی تکثیری خصوصیت ہے کہ یہ صرف ذات باری تعالیٰ کا خاصہ بن گیا ہے۔ رحم اور رحمت کے دیگر مشتقات کا اطلاق دوسرے افراد پر ہو سکتا ہے مگر رحمٰن اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں کہا جا سکتا۔ گویا یہ ذات حق کا علم خاص تصور ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ''اللہ'' کے ساتھ متصلاً رحمٰن کا لفظ استعمال کر کے اس کی صفت رحمت کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے الرحمٰن کو اصطلاحاً باری تعالیٰ کی

شانِ الوہیت کو نمایاں کرنے کے لئے بھی استعمال کیا ہے‘ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی۔

فرما دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو جس نام سے بھی پکارتے ہو (سب) اچھے نام اسی کے ہیں۔

(بنی اسرائیل‘ ۱۷: ۱۱۰)

اس آیت میں تعلیم یہ دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں۔ سو جس نام سے چاہو اسے پکار لو لیکن اسم ذات ’’اللہ‘‘ کا جو مترادف قرآن نے خود بیان کیا ہے وہ ’’الرحمٰن‘‘ ہے۔ جس سے اس لفظ کی اسمی خصوصیت اجاگر ہوتی ہے۔

اسی طرح صرف سورہ مریم میں ہی کم و بیش سترہ (۱۷) مرتبہ ’’الرحمٰن‘‘ کا لفظ باری تعالیٰ کی الوہیت‘ خلاقیت اور ربوبیت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ لَلِلرَّحْمٰنِ دَعَوْا وَلَدًا o یَتَّخِذَ

کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا o

اَنْ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی (آباد) اَنْ لِلرَّحْمٰنِ (خواہ فرشتے) ہیں یا جن وانس) وہ اللہ کے حضور محض بندہ کے طور پر حاضر ہونے والے ہیں۔

(مریم‘ ۱۹: ۹۱۔۹۳)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْا اَمْرِیْ o

حالانکہ بے شک تمہارا رب (یہ نہیں وہی) رحمان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو o

(طٰہٰ‘ ۲۰: ۹۰)

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا o وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا o

پھر وہ (حسب شان) عرش پر جلوہ افروز ہوا (وہ) رحمان ہے (اے معرفت حق کے طالب) تو اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ (بے خبر اس کا حال نہیں جانتے) o

(الفرقان‘ ۲۵: ۵۹۔۶۰)

ان آیات میں الرحمٰن کا ذکر کتنے پیارے اور وجد انگیز انداز میں کیا گیا ہے۔ ’’اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا‘‘ کے الفاظ میں لفظ رحمٰن کی کتنی معنوی وسعت ہے اور اس کی

معرفت کی خصوصیت پنہاں ہے۔ اسے اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی شان رحمانیت‘ عام لوگوں کو کیا معلوم ہوگی۔ اس کا اندازہ تو انھیں کو ہے جو شراب معرفت کا جام پی کر ماسوا سے بے خبر اور عرش معلیٰ پر چمکنے والے نور ازل سے باخبر ہیں اور اسی کے حسن مطلق کے جلوے دیکھنے میں مست و بے خود ہیں۔ اگر تھوڑی سی بھی توجہ کی جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ جا بجا ’’الرحمٰن‘‘ کا لفظ باری تعالیٰ کے اسم ذات کے بدل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت یہ ذات حق کا صفاتی نام ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَo	کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کچھ اور خدا اٹھہرائے تھے جن کی عبادت کی جائے o
(الزخرف‘۴۳: ۴۵)	

متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر طے پا گیا کہ الرحمٰن صفاتی نام ہونے کے باوجود ذات باری تعالیٰ کے بیان کے لئے اس قدر مخصوص و منفرد ہو گیا ہے کہ اس کا اطلاق کسی اور کے لئے جائز نہیں رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کئی صفاتی اسماء ایسے ہیں‘ جو مخلوقات کے لئے بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً رحیم‘ کریم‘ رؤف‘ شہید‘ سمیع‘ بصیر وغیرھا لیکن خالق و مخلوق ہر ایک کے لئے ان کا استعمال ان کی حیثیت اور شان کے مطابق ہوگا۔ اسم رحمٰن کا خاصہ الٰہی ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس میں صفت رحمت جتنی کثرت‘ نہایت اور مبالغے کے ساتھ موجود ہے۔ وہ صرف خالق کائنات ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ کسی مخلوق کے حق میں متصور نہیں ہو سکتی۔

الرحیم کے لغوی اور اصطلاحی معنی

الرحمٰن کے بعد دوسرا اسم صفت الرحیم ہے۔ اس کا معنی بھی ’’بہت رحم فرمانے والا‘‘ ہے۔ یہ ’’رحمت‘‘ سے ’’فعیل‘‘ کے وزن پر اسم فاعل ہے اور اس میں بھی معنوی مبالغے کی صفت پائی جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ الرحیم‘ صفت مشبہ ہے۔ اس میں صفت رحم کے اعتبار سے ہمیشگی اور دوام واستمرار کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ الرحیم اصطلاحی اعتبار سے الرحمٰن کے مقابلے میں عام ہے۔ اس کا استعمال غیر خدا کے لئے بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے استعمال کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں۔:

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُo (البقرہ‘۲: ۵۴)	یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے o
اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌo (البقرہ‘۲: ۱۴۳)	بے شک اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے o

اُولٰئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللهِ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌo

یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے o

(البقرہ، ۲:۲۱۸)

اسی طرح کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمت کا بیان ''الرحیم'' کے ذریعے کیا ہے۔ لیکن یہی لفظ جناب رحمۃ للعالمین ﷺ کی شان بیان کرنے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

صفات کا اشتراک اور اختصاص

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنی بعض صفات کو انبیاء اور دیگر مخلوقات کے لئے بھی ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے۔

رؤف ورحیم

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌo

(التوبہ، ۹:۱۲۸)

بے شک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول تشریف لائے تمہارا تکلیف ومشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (لوگو!) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب وآرزومند رہتے ہیں (اور) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔

آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام رؤف اور رحیم نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کی توصیف میں بیان ہوئے ہیں۔ جب کہ لفظ رحمن کے لئے ایسا ممکن نہیں حالانکہ تینوں صفات الٰہیہ ہیں اور ان کا معنی بھی ایک ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو صفات الٰہیہ میں سے ہر ایک صفت کا اثبات مخلوق کے لئے جائز ہے اور نہ ایک صفت کا عدم اثبات۔ مختلف صفات کا معاملہ مختلف ہے۔ بعض صفات الٰہیہ ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عام مخلوق سے بھی بعض کے لئے ثابت کی ہیں۔ اس امر کی مزید تائید ملاحظہ ہو۔

سمیع وبصیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا○

بیشک ہم نے آدمی کو ملے ہوئے نطفے سے پیدا کیا کہ اسے جانچیں۔ پس اسے ہم نے سننے والا، دیکھنے والا بنادیا○

(الدھر ۷۶:۲)

یہاں قرآن نے انسان کا ''سمیع و بصیر'' کی صفات سے بہرہ ور ہونا بیان کیا ہے حالانکہ یہی صفات جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیان ہوئی ہیں۔ ارشاد الٰہی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا○

بے شک اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے○

(النساء ۴:۵۸)

شہید

قرآن حکیم میں آنحضرت ﷺ کے لئے یہ صفات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔

(البقرہ ۲:۱۴۳)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَابِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا○

پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے○

(النساء ۴:۴۱)

لیکن یہی صفت شہید جگہ جگہ باری تعالیٰ کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔

پس اللہ ہی گواہ کافی ہے۔

(یونس ۱۰:۲۹)

اسی طرح حیات، علم، کلام، ارادہ، جمال، جود و سخا، عطا و غنا، ملک و حکمرانی، مدد و اعانت اور عدل و انتقام وغیرہا ایسی متعدد صفات ہیں جو قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ ذات باری اور مخلوقات دونوں کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ لیکن الوہیت، ربوبیت، معبودیت، رحمانیت اور مالکیت وغیرہا ایسی صفات ہیں جو صرف ذات باری سے ہی مختص ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے ان کا ثبوت جائز نہیں۔ صفات الٰہیہ میں بعض کا اشتراک اور بعض کا اختصاص اس فرق کی بنیاد پر ہے کہ کچھ صفتیں ''خاصے'' کے درجے میں ہوتی ہیں اور کچھ محض صفات کے۔ محض صفت دوسروں کے لئے ثابت ہوسکتی ہے لیکن خاصہ نہیں۔ جس طرح نبوت تمام انبیاء کی مشترک صفت

ہے لیکن ختم نبوت صرف حضور علیہ السلام کا خاصہ ہے۔ وہ کسی اور کے لئے ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ صفات باری تعالیٰ اپنی ''اسمی حیثیت'' کے اعتبار سے عام بھی ہیں اور خاص بھی۔ رحمٰن خاص ہے اور رحیم عام۔ اس لئے اگر خاصہ الٰہی کو کسی اور ذات کے لئے ثابت کریں گے تو شرک واقع ہو گا۔ مگر صرف صفت الٰہی کو کسی اور کے لئے مانیں گے تو شرک تصور نہیں کیا جائے گا۔ ہاں یہ امتیاز ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ اشتراک صفات کی صورت میں دونوں کے لئے صفات کا اثبات اپنی اپنی نوعیّتوں کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوگا۔ مثلاً وہی صفت جب خالق کے لئے ثابت ہوگی تو وہ ذاتی 'ازلی وابدی' واجب وقدیم' غیر محدود لامتناہی اور اس کی شان خالقیت کے لائق ہوگی اور جب کسی مخلوق کے لئے ثابت ہوگی تو عطائی' عارضی' ممکن وحادث' محدود ومتناہی اور اس کی شان مخلوقیت کے لائق ہوگی۔ اس فرق ماہیت کے ہوتے ہوئے شرک کا شائبہ نہیں رہتا۔ خلاصہ بحث یہ ہوا کہ الرحمٰن خاصہ الٰہی ہے' باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رحمٰن نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ الرحیم محض صفت الٰہی ہے۔ اس کا اطلاق دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم میں معنوی امتیاز

رحمٰن اور رحیم کے لغوی اور اصطلاحی معنی سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں اسم مبالغے کے ساتھ حق کی نشاندہی کرتے ہیں تو ان کو الگ الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا دونوں اسماء مختلف مرادی معنوں پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ الرحمٰن اور الرحیم' ہر چند کہ ایک ہی مادے اور اصل سے ہیں لیکن ان کے معنوی اطلاقات جدا جدا ہیں اور دونوں کو اس لئے انفرادیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر ایک کا مدعا و مفہوم علیحدہ علیحدہ ثابت ہو سکے۔ الرحمٰن اور الرحیم' میں معنوی امتیاز کی چند وجوہ ہیں جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

الرحمٰن............رحمت حق کا صفتی ظہور

الرحیم ....رحمت حق کا فعلی ظہور

عربی قاعدے کی رو سے الرحمٰن ''اسم فعلان'' کے وزن پر واقع ہوا ہے۔ فعلان کا باب عام طور پر ایسی صفات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو محض حالت کی حیثیت سے کسی ذات میں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً پیاسے کے لئے عطشان' مست و بے خود کے لئے ''سکران''' غضبناک شخص کے لئے ''غضبان''' پریشان و ششدر ہونے والے کے لئے ''حیران''' بہنے والے مائع کے لئے ''جریان'' اور سرکشی وبغاوت کے لئے ''طغیان''۔ الغرض یہ سب اسماء ایسی صفت کی نشاندہی کرتے ہیں جو باوجود کثرت وفراوانی کے ان کا بطور ''حالت'' واقع ہونا ظاہر کر رہی ہوں۔ یعنی عطشان سے کسی شخص کی حالت پیاس ظاہر ہو رہی ہے۔ سکران سے کسی کی مستی و بے خودی کی

کیفیت ظاہر ہو رہی ہے۔ غضبان سے کسی کے غیض وغضب کی حالت کا پتہ چل رہا ہے۔ ''حیران'' سے کسی کی سراسیمگی اجاگر ہو رہی ہے۔ ''جریان'' سے کسی مائع کا بہاؤ معلوم ہو رہا ہے اور ''طغیان'' سے کسی کی بغاوت وسرکشی کی حالت وکیفیت کا علم ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر اسم کسی نہ کسی ذات کی ایسی صفت پر دلالت کرتا ہے جو اس کی حالت سے عیاں ہوتی ہے۔ اسی طرح الرحمٰن غایت ونہایت کے ساتھ اللہ تعالٰی کی صفت رحمت پر اس انداز سے دلالت کرتا ہے کہ رحمت اس ذات کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی رحمٰن وہ ذات ہے جو حالت رحمت سے متصف ہے۔ لیکن الرحیم فعیل کے وزن پر ہونے کی وجہ سے صرف حالت رحمت کو ہی نہیں بلکہ ذات حق سے فعل رحمت کے صدور کو نمایاں کو رہا ہے' کیونکہ فعیل کا باب بالعموم صفات کے فعلی ظہور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''کریم'' اسے کہا جاتا جس سے سخاوت اور جود وکرم کا صدور ہو رہا ہو' ''علیم'' اسے کہا جاتا ہے جس سے علم ومعرفت کا فعلی ظہور ہو رہا ہو۔ ''حکیم'' اسے کہا جاتا ہے' جس کے ہر کام سے حکمت ودانائی کا صدور رہو رہا ہو۔ ''عظیم'' اسے کہا جاتا ہے جس سے عظمت وبزرگی کا صدور ہو رہا ہو۔ اسی طرح الرحیم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ذات جس میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ اس میں رحمت فراوانی کے ساتھ گویا الرحمٰن ذات حق کے رحمت ہونے کی دلیل تھا۔ الرحیم اس کے رحمت صادر کرنے کی دلیل بن گیا۔ ''الرحمٰن'' سے رحمت کا ظہور تھا۔ ''الرحیم'' سے رحمت کا صدور ثابت ہو گیا۔ چنانچہ دونوں اسماء کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ رحمانیت کے ذکر سے انسانوں کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ ذات والا صفات سراسر رحمت ہے اور رحیمیت کے ذکر سے یہ پتہ چل جائے کہ اس کا ہر کام بھی اول سے آخر تک رحمت ہے۔ رحمت حق کا صفتی ظہور قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے۔

وَ رَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُوالرَّحْمَةِ۔ (الانعام ۶:۱۳۳)	اور آپ کا رب بے نیاز ہے (بڑی) رحمت والا ہے۔

اور رحمت حق کا فعلی ظہور اس آیت میں مذکور ہے۔

اُولٰئِکَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ○ (التوبہ ۹:۷۱)	ان ہی لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا بے شک اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے○

پہلی آیت میں موصوفیت کا انداز ہے اور دوسری میں فاعلیت کا۔ پس الرحمٰن اور الرحیم میں یہی معنوی امتیاز کارفرما ہے۔

الرحمٰن ....عموم رحمت کا بیان

الرحیم ....خصوص رحمت کا بیان

رحمانیت کا فیضان اپنے دائرہ اثر کے لحاظ سے عام ہے اور رحیمیت کا خاص۔ الرحمٰن ایسی شان رحمت پر دلالت کرتا ہے جو موجودات عالم میں سے ہر ایک فرد کے لئے بلا استثنٰی ثابت ہے اور الرحیم کی رحمت مومنوں کے لئے خاص ہے چونکہ الرحمٰن کا لفظ باری تعالیٰ نے اپنی شان خلاقیت و ربوبیت کے اظہار کے لئے اختیار فرمایا ہے اور اس کی خلاقیت و ربوبیت ساری کائنات کے افراد کے لئے عام ہے۔ کسی خاص طبقے، جنس و نوع اور گروہ کے لئے مخصوص نہیں۔ وہ ساری مخلوقات کا بلا استثنٰی خالق و رب ہے۔ کوئی اسے مانے یا نہ مانے اس کی بارگاہ الوہیت میں کوئی سر تسلیم خم کرے یا نہ کرے۔ کوئی اس کی اطاعت و غلامی اختیار کرے یا بغاوت و سرکشی، کوئی بزعم خویش اس کا بندہ بنے یا کسی اور کا، کوئی اس سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے، کوئی اس سے رحمت طلب کرے یا نہ کرے اس کی خالقیت و ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر حال میں ہر فرد کو اپنی رحمت سے نوازے، ہر شخص کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ ہر ایک کو روزی دے، ہر ایک کو بیماری سے شفا دے، ہر ایک کو تکلیف سے نجات دے اور ہر ایک کو ضروریات حیات عطا کرے۔ پس اس کی خالقیت کا تقاضائے رحمت اس کی شان رحمانیت سے پورا ہو رہا ہے۔ وہ چونکہ رحمٰن ہے اس لئے اس کے خوان رحمت اور خرمن نعمت سے ہر مسلم و کافر برابر حصہ پا رہا ہے۔ اس کی عطائیں انسان کی طرح نہیں کہ اگر نوازا جانے والا شخص اپنے محسن کی نوازشوں کا انکار کر دے اس کی عنایات و احسانات کو فراموش کر دے اور اس کی رضا و خوشنودی کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دے تو محسن اپنی نوازشوں کا سلسلہ منقطع کر لیتا ہے۔ اور اپنی عنایات اس سے ہمیشہ کے لئے روک لیتا ہے۔ لیکن خالق کائنات کی شان رحمانیت اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔ روئے زمین پر کتنے انسان اس کی ہستی سے کھلا کفر کر رہے ہیں۔ اس کے وجود، اس کی توحید، اس کی الوہیت، اس کی خالقیت، اس کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت کا برملا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے کسی سے اپنی رحمتوں کو روک لیا ہو اور کسی کو اپنی نوازشوں سے محروم کر دیا ہو۔ اس کی رحمت کی یہ عمومیت اس کے نام الرحمٰن سے جھلک رہی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰىO (طٰہٰ ۲۰: ۵)	(وہ) نہایت رحمت والا (ہے) جو عرش (یعنی جملہ نظامہائے کائنات کے اقتدار) پر متمکن ہو گیاO

یہاں استواء علی العرش کا بیان اس کی شان رحمانیت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عرش ساری کائنات پر سایہ فگن ہے۔ اسی طرح الرحمٰن کے سرچشمہ رحمت سے ساری کائنات سیراب ہو رہی ہے لیکن جو لوگ عام افراد سے ہٹ کر اپنے آقا کی خصوصی اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ ہمہ وقت اس کی یاد اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے شب و روز اسی کی رضا کے مطابق بسر کرتے ہیں۔ ضروری تھا کہ ان کے لئے باری تعالیٰ کی

رحمت مطلقہ میں سے خصوصی حصہ مقرر ہو اور وہ اپنے نیک اعمال کے بدلے میں زیادہ سے زیادہ رحمت الٰہی سے نوازے جائیں۔ پس ان مومنین و متقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان رحیمیت کو مخصوص کر دیا۔ اسی وجہ سے الرحیم، الرحمٰن کے مقابلے میں بالالتزام اہل ایمان اور صالحین کو رحمت سے نوازنے کی صفت کو ظاہر کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ○ اور وہ مومنوں کے لئے رحیم ہے۔

(الاحزاب، ۳۳: ۴۳)

الرحمٰن ....تمام انواع رحمت کو شامل ہے

الرحیم ....قبول توبہ اور مغفرت کو شامل ہے

الرحمٰن کے اسم سے جس رحمت کا ظہور ہو رہا ہے وہ اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے عام ہے۔ یعنی رحمت کی جتنی صورتیں اور مدارج و مراحل ہو سکتے تھے وہ سب رحمانیت کے دائرے میں شامل ہیں۔ مگر الرحیم سے رحمت حق کا جو پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ بالخصوص توبہ و مغفرت سے متعلق ہے۔ رحمت درحقیقت اس کائنات کی ضرورت ہے۔ موجودات عالم کا ایک ایک ذرہ باری تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہے۔ ہر ہستی کی ضرورت کو پورا کرنا رحمت کہلاتا ہے۔ جیسے مخلوقات کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ویسے ہی رحمت کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ پیاسے کے لئے پانی رحمت ہے اور بھوکے کے لئے کھانا۔ بیمار کے لئے صحت رحمت ہے اور تھکے ماندے انسان کے لئے آرام۔ الغرض ہر ضرورت مند کے لئے اسی کی طلب اور ضرورت کے لحاظ سے رحمت کی نوعیت بدلتی جائے گی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ضرورت تو کسی اور شے کی ہو لیکن رحمت کسی اور شے کو قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ ضرورت اور رحمت کے تعلق کو جانتے ہوئے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ضرورت کے تین درجے ہیں اور ہر درجے کی حیثیت کے مطابق رحمت بھی تین طرح کی ہے۔:

پہلا درجہ......ایجاد......کسی شے کو معرض وجود میں لانا۔

دوسرا درجہ......ابقاء......وجود میں لانے کے بعد اسے باقی رکھنا۔

تیسرا درجہ......اکمال ......وجود کو باقی رکھ کر اسے نقطہ کمال تک پہنچانا۔

www.MinhajBooks.com

ا۔ رحمت حق کا ایجادی پہلو

سب سے پہلے عدم سے وجود میں آنے کا مرحلہ آتا ہے۔ عدم سے وجود میں آنا ایک ضرورت ہے جو بغیر رحمت کے پوری نہیں ہو سکتی۔ جب رحمت حق کی پہلی نوع ایجاد کے ارادے سے عدم کی طرف متوجہ ہوئی تو عدم کو وجود مل گیا۔ انسان کو باری تعالیٰ اپنی ایجادی رحمت کی یاد اس

طرح دلاتا ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○

بے شک آدمی پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا۔

(الدھر‘ ۷۶:۱)

قرآن انسان کو وہ وقت یاد دلا رہا ہے جب وہ عدم محض تھا اور رحمت الٰہی نے اسے وجود اور ظہور عطا کر دیا۔ اسی طرح ایک اور مقام پر انسان کو خطاب کرتے ہوئے تنبیہہ کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ○ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○

انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم سے نافرمان کر دیا۔ جس نے تجھے کیا) پھر تجھے اعضاء و جوارح کے اعتبار سے سالم بنایا۔ پھر تیرے اعضاء جسمانی میں تناسب و توازن پیدا کیا۔ تجھے جس صورت میں چاہا ترکیب دیا۔

(الانفطار‘ ۸۲:۶۔۸)

یہ تو انسان کو خلعت وجود عطا کرنے کی بات تھی۔ قرآن نے ایک اور مقام پر جملہ مخلوقات کو وجود عطا کرنے کا ذکر یوں کیا ہے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○

(موسیٰ نے) فرمایا ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسب حال) اس کی رہنمائی کی ○

(طٰہٰ‘ ۲۰:۵۰)

خلق کے بعد ہدایت کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ معرض وجود میں لانے کے بعد اسے باقی رکھنے اور کمال تک پہنچانے کے بھی کئی تقاضے ہیں۔ جن کے لئے انسانی سطح پر بالخصوص ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ابتداء ''جبلی''، پھر ''حسی''، پھر عقلی اور پھر ''وجدانی'' طور پر نصیب ہوتی ہے۔ لیکن وجود انسانی کے تمام وسائل کا حتمی و قطعی حل انسانی استعداد میں ودیعت کی ہوئی ان نفسی ہدایتوں سے میسر نہیں آ سکتا۔ اس لئے اس کی ضرورتوں کی صحیح تکمیل کی خاطر انبیاء علیھم السلام کے ذریعے ہدایت الہامی عطا کی جاتی ہے تاکہ انسان کی کوئی حاجت بھی تشنہ تکمیل نہ رہے۔ گویا جب وجود عالم ظہور میں آ جاتا ہے تو اس کی بقاء خود ایک بنیادی ضرورت بن جاتی ہے۔

۲۔ رحمت حق کا ابقائی پہلو

یہ شان رحمانیت کا وہ پہلو ہے جو عالم ہستی میں وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اگر وجود باقی نہ

رہے تو اس کی خلق کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا لہٰذا رحمت الٰہی کی دوسری نوع ابقاء کے ارادے سے اس وجود کی طرف متوجہ ہوتی ہے...... اور اسے عالم خارج میں باقی رکھتی ہے۔

جس طرح عدم کا وجود میں آنا باری تعالیٰ کی ایجادی رحمت کا محتاج تھا۔ اسی طرح وجود کا باقی رہنا باری تعالیٰ کی ابقائی رحمت کا محتاج ہے۔ اگر رحمت حق کی یہ نوع عالم وجود کی طرف متوجہ نہ ہو تو وجود انسان بلکہ وجود کائنات ایک لمحہ بھر کے لئے بھی باقی نہ رہ سکے۔ اگر موجودات عالم اور نظام کائنات کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ذات رحمان نے اپنی رحمت کا ظہور اس طرح کیا ہے کہ ہر ایک شے کو اس غرض سے پیدا کیا گیا کہ وہ انسانی بقاء کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے۔ اس کی شان رحمانیت کا پرتو ہر ایک ذرے میں دکھائی دے رہا ہے۔

زمین کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

قرآن حکیم نے زمین کی پیدائش، ساخت، جسامت، سطح اور اس کی تہ کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ تمام آیات اور ان کے مطالب یکسانیت کے ساتھ اسی امر پر زور دیتے ہیں کہ سارا نظام ارضی انسانی بقاء کے لئے رحمت الٰہی کی متشکل صورت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهَارًا ۝ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(الرعد، ۱۳: ۳۔۴)

اور وہی ہے جس نے (گولائی کے باوجود) زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں میں (بھی) اس نے دو دو (جنسوں کے) جوڑے بنائے (وہی) رات سے دن کو ڈھانک لیتا ہے بے شک اس میں تفکر کرنے والوں کے لئے (بہت) نشانیاں ہیں اور زمین (مختلف قسم کے) قطعات ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جھنڈ دار اور بغیر جھنڈ کے ان (سب) کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور (اس کے باوجود) ہم ذائقہ میں بعض کو بعض پر فضیلت بخشتے ہیں بے شک اس میں عقلمندوں کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں ۝

ان آیات کے ایک ایک لفظ سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قدرت نے یہ سارا نظام

انسانی بقا کی ضرورتوں کو پورا کرنے لے لئے پیدا کیا ہے۔ یہی حقیقت ایک اور مقام پر انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کی گئی ہے' ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

(الاعراف' ۷: ۱۰)

اور بے شک ہم نے تم کو زمین میں تمکن و تصرف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسباب معیشت پیدا کئے تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو ○

دریاؤں اور سمندروں کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

سمندر اور اس کے اندر جو کچھ موجود ہے۔ سب انسانی بقاء کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تخلیق بھی رحمت الٰہی کی بین دلیل ہے' ارشاد ربانی ملاحظہ ہو۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

(النحل' ۱۶: ۱۴)

اور وہی ہے جس نے (فضا و بر کے علاوہ) بحر (یعنی دریاؤں اور سمندروں) کو بھی مسخر فرما دیا تا کہ تم اس میں تازہ (و پسندیدہ) گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے موتی (وغیرہ) نکالو جنہیں تم زیبائش کے لئے پہنتے ہو اور (اے انسان) تو کشتیوں (اور جہازوں) کو دیکھتا ہے جو (دریاؤں اور سمندروں کا) پانی چیرتے ہوئے اس میں چلے جاتے ہیں (اور یہ سب کچھ اس لئے کیا) تا کہ تم (دور دور تک) اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو اور یہ کہ تم شکر گزار بن جاؤ ○

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔

(البقرہ' ۲: ۱۶۴)

اور ان جہازوں (اور کشتیوں) میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اٹھا کر چلتی ہیں۔

دریاؤں اور سمندروں کے شکار بھی انسانی بقا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حلال قرار دیئے گئے ہیں' ارشاد رب العزت ہے۔

اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِلسَّیَّارَةِ۔
(المائدہ، ۵:۹۶)

تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے اور مسافروں کے فائدے کی خاطر حلال کر دیا گیا ہے۔

حیوانات کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

روئے زمین پر بسنے والی دیگر جاندار مخلوق حیوانات، مویشی اور چوپائے وغیرہ سب وجود انسانی کی بقاء کی خاطر معرض تخلیق میں آئے ہیں۔ یہ سب کچھ رحمت الٰہی کی ابقائی نوع کا ظہور ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْکُلُوْنَ وَ لَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ o وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ o وَ الْخَیْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْهَا وَ زِیْنَةً وَ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ o
(النحل، ۱۶:۵-۶)

اور اسی نے تمہارے لئے چوپائے پیدا فرمائے ان مین تمہارے لئے گرم لباس ہے اور (دوسرے) فوائد ہیں اور ان میں سے ہو o اور ان میں تمہارے لئے رزق (اور دلکشی بھی) ہے جب تم شام کو چراگاہ سے (واپس) لاتے ہو اور جب تم صبح کو (چرانے کے لئے) لے ہو o اور یہ (جانور) تمہارے بوجھ (بھی) ان شہروں تک اٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر جانکاہ مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے، بے شک تمہارا رب نہایت شفقت والا نہایت مہربان ہے o

اسی سورۃ میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ o
(النحل، ۱۶:۶۶)

اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں (بھی) مقام غور ہے ہم ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے (بعض) مشمولات اور خون کے اختلاط سے (وجود مین آتی ہے) خالص دودھ نکال کر تمہیں پلاتے ہیں (جو) پینے والوں کے لئے فرحت بخش ہوتا ہے o

اسی سورۃ میں مزید فرمایا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍo
(النحل،۱۶:۸۰)

اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو (مستقل) سکونت کی جگہ بنایا اور تمہارے لئے چوپایوں کی کھالوں سے (عارضی گھر یعنی خیمے) بنائے جنہیں تم اپنے سفر کے وقت اور (دوران سفر منزلوں پر) اپنے ٹھہرنے کے وقت ہلکا پھلکا پاتے ہو اور (اسی اللہ نے تمہارے لئے) بھیڑوں اور دنبوں کی اون اور اونٹوں کی پشم اور بکریوں کے بالوں سے گھریلو استعمال اور (معیشت وتجارت میں) فائدہ اٹھانے کے اسباب بنائے (جو) مقررہ مدت تک (ہیں)o

یہ وہ تمام فطری صنعتیں ہیں جنھیں فروغ دے کر عقل انسانی نے ایک منظّم مشینی کائنات بسالی ہے۔ لیکن قدم قدم پر انسان کو ہر شے کی تخلیق جس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ سب موجودات عالم صرف اور صرف انسانی بقا کی خاطر وجود میں لائے گئے ہیں تا کہ انسان اپنے وجود کو باقی رکھنے اور مقاصد حیات کے حصول کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے ان سے استفادہ کر سکے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان خلوت کی زندگی بسر کرے یا جلوت کی، تجرد کی زندگی بسر کرے یا ازدواجیت کی، الگ تھلگ جنگلوں میں رہے یا مہذب و متمدن معاشرے میں ان ضروریات زندگی سے بے نیاز ہو کر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے انسان کے مانگے بغیر اس کی ضرورتوں کی تکمیل کر دی ہے۔ یہ اس کی ابقائی رحمت کا پہلو ہے بلکہ ان موجودات وحیوانات میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کی بقا کا بھی ضامن ہے۔ یعنی یہ رحمت نہ صرف انسانوں کے لئے ہے بلکہ تمام مخلوقات کے لئے ان کی اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق یکساں ہے۔

شجر وحجر کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

صفحہ ہستی پر شجر وحجر کا وجود بھی انسان اور حیوانات کے لئے رحمت الٰہی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ o

(یٰسین، ۳۶:۸۰)

یہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے سر سبز درختوں سے آگ پیدا کر دی اب تم انہیں میں سے آگ سلگاتے ہو۔

اور سورہ نحل میں مذکور ہے۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ o

(النحل، ۱۶:۸۱)

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کردہ کئی چیزوں کے سائے بنائے اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور اس نے تمہارے لئے (کچھ) ایسے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (کچھ) ایسے لباس جو تمہیں شدید جنگ میں (دشمن کے وار سے) بچاتے ہیں اس طرح اللہ تم پر اپنی نعمت (کفالت و حفاظت) پوری فرماتا ہے تاکہ تم (اس کے حضور) سرِ نیاز خم کر دو o

شمس وقمر کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

باری تعالٰی نے شمس وقمر اور ان کے نظاموں کو بھی انسان کے لئے وجود عطا کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تخلیق بھی انسان کے حق میں رحمت الٰہی ہے اور دیگر جاندار مخلوقات بھی ان سے اپنی بقا کا سامان حاصل کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ

(ابراہیم، ۱۴:۳۳)

اور تمہارے لئے سورج اور چاند مسخر کر دیئے۔ یہ دونوں ایک خاص ڈھنگ پر گردش میں ہیں اور رات اور دن بھی تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیئے۔

کائنات ارض وسما کی تخلیق رحمت الٰہی ہے

مختصر یہ کہ کائنات ارض وسما میں جو کچھ بھی ہے سب وجود انسانی کے لئے اللہ تعالٰی کی رحمت ونعمت ہے اور ان کی غرض تخلیق بھی انسان ہی کو فائدہ پہنچانا ہے۔

قرآن اس امر کی وضاحت یوں کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً۔
(لقمان، ۳۱:۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام نعمتیں اور رحمتیں تم پر ظاہراً اور باطناً پوری کر دی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وجود و ظہور کی نعمت سے بہرہ ور کیا یہ اس کی رحمانیت کے ایجادی پہلو کا صدور تھا پھر اس نے عالم ہستی میں انسانی وجود کو باقی رکھنے کے لئے تمام ضروریات پوری کر دیں اور انسانی منفعت کی خاطر ہزاروں نظام وضع فرمائے۔ یہ اس کی رحمانیت کے ابقائی پہلو کا صدور ہے۔

۳۔ رحمتِ حق کا اکمالی پہلو

جس طرح کسی وجود کا معرض ظہور میں آنا یا کسی کا حالت عدم سے حالت وجود میں منتقل ہونا اس غرض سے تھا کہ وہ باقی رہے کیونکہ بقا کے بغیر وجود کا کوئی مقصد نہیں۔ اسی طرح وجود کا باقی رہنا بھی فی نفسہ کوئی مقصد نہیں۔ بقاء تو محض اس لئے مطلوب ہوتی ہے کہ کمال حاصل ہو۔ وجود کو اپنی تکمیل کے لئے بقاء کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اصل ضرورت تکمیل ہے باقی سب مراحل اس کے لوازمات ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں صفات کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد از خود واضح ہے۔ چنانچہ اس غرض سے رحمت حق کی تیسری نوع اکمال کے ارادے کے ساتھ وجود کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسے اپنے مطلوبہ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ وجود کی یہ تکمیل تدریج وارتقاء کے اصول پر ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر رحمت حق کا ظہور باری تعالیٰ کی شان ربوبیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کا تفصیلی بیان ''رب العالمین'' کی تفسیر کے موقع پر ہوگا۔ اس وقت صرف اتنا جاننا درکار ہے کہ کائنات کا ہر وجود اپنی بقا کے ساتھ تکمیل کے سفر میں گامزن ہے اور رحمت الٰہی کا التفات کائناتی موجودات کو کمال و اتمام تک پہنچانے کے لئے ہمہ وقت قائم و دائم ہے۔ جس کا اظہار اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

لہٰذا شان رحمانیت کا امتیاز یہ ہے کہ انسان اور دیگر مخلوقات وجود میں آنے، باقی رہنے اور اپنے کمال کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ذات رحمٰن کے محتاج ہیں۔ رحمت الٰہی کے بغیر نہ کسی کو کائنات میں وجود مل سکتا ہے نہ کوئی وجود باقی رہ سکتا ہے اور نہ کوئی اپنی تکمیلی جدوجہد کو پورا کر سکتا ہے۔ چونکہ مخلوقات عالم اپنی مختلف ضروریات کے پیش نظر ہر مرحلہ حیات پر ذات رحمٰن کے محتاج

ہیں۔اس لئے اس کی رحمت بھی تمام انواع واقسام ضرورت کوشامل ہے تاکہ ہر کسی کو حسب حال رحمت حق کا حصہ مل سکے۔ یہ شان ''الرحمٰن'' کی تھی۔لیکن ''الرحیم'' رحمت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے جو بخشش و مغفرت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔یعنی کسی کو وجود و بقا اور کمال سے ہمکنار کرنا ''رحمانیت'' کا کام تھا۔مگر کسی وجود کو اپنی بقا کے خلاف کارگزاریوں پر معاف کر دینا اور اس کے باوجود اسے باقی رکھنا ''رحیمیت'' کا کام ہے۔اگر کوئی وجود ایسی خطائیں اور لغزشیں صادر کرے جس سے وہ باقی رہنے یا کمال پانے کے قابل نہ رہے بلکہ مٹا دیئے جانے کے لائق ہو جائے تو اس کی خطاؤں کو معاف کر کے اسے پھر مستحق نعمت بنا دینا رحیمیت کہلاتا ہے۔اس گوشہ رحمت کا نام بخشش و مغفرت ہے۔وصف رحیم اکثر و بیشتر قرآن حکیم میں امتیاز کے ساتھ بیان ہوا ہے۔کبھی یہ رؤف رحیم کے طور پر آیا ہے کبھی ''توابا رحیما'' کے طور پر اور کبھی غفور رحیم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔الغرض اس کے ساتھ بالعموم کوئی نہ کوئی ایسا وصف ضرور مذکور ہوتا ہے جس کا معنیٰ بالواسطہ یا بلاواسطہ بخشش اور مغفرت پر دلالت کرے۔ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًاO (النساء، ۴:۱۶)	بے شک اللہ بڑا توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہےO
اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًاO (النساء، ۴:۲۳)	بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہےO
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًاO (النساء، ۴:۶۴)	وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتےO

www.MinhajBooks.com

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاo (النساء ۴:۹۶)

اس کی طرف سے (ان کے لئے بہت) درجات ہیں اور بخشائش اور رحمت ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہےo

الغرض رحیمیت کا وصف اکثر و بیشتر ''غفوریت'' اور ''توابیت'' ایسے اوصاف کے ساتھ متصلاً بیان ہوا ہے جس سے اس کی رحمت کی وہ خصوصی نوعیت متعین ہو جاتی ہے جو اپنے دامن میں بخشش و مغفرت کی دولت رکھتی ہے۔

الرحمٰن...........دنیا کی رحمت کا آئینہ دار ہے

الرحیم...........آخرت کی رحمت کا آئینہ دار ہے

مفسرین نے بالعموم الرحمٰن کو ''رحمان الدنیا والاخرۃ'' اور الرحیم کو ''رحیم الاخرۃ'' کے طور پر واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک رحمانیت دنیا و آخرت دونوں کی رحمت کو شامل ہے اور رحیمیت صرف آخرت کی رحمت کو اور اسی امتیاز کی بنا پر رحمٰن میں مبالغہ رحمت رحیم کی نسبت شدید تصور کیا جاتا ہے لیکن بعض نے رحمٰن کو رحمت دنیا سے اور رحیم کو رحمت آخرت سے مخصوص کیا ہے۔ بہرحال رحمانیت میں دنیا کی رحمت کا پہلو غالب ہے کیونکہ یہی تصور عموم رحمت کے پہلو کی بھی تائید کرتا ہے۔ دنیا کی رحمت مسلم و غیر مسلم سب کے لئے برابر فراوانی کے ساتھ صادر ہوتی ہے جب کہ آخرت میں حصہ رحمت پانے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ایماندار بندے خصوصیت کے ساتھ مستحق ہوں گے۔ لہٰذا ''الرحمٰن'' کا اسم صفت ہر مومن و کافر کو اس حیات دنیوی میں رحمت ایزدی کا مژدہ جانفزا سنا رہا ہے۔ اور ''الرحیم'' کا اسم صفت آخرت میں مومنین کو رحمت خداوندی کی خوشخبری سنا رہا ہے۔

امام ابن مبارکؒ کا قول

الرحمٰن اور الرحیم کے درمیان وجہ امتیاز بیان کرنے کے سلسلے میں امام عبداللہ بن مبارکؒ کا ایک قول نہایت لطیف نکتے پر مشتمل ہے، وہ فرماتے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ اِذَا سُئِلَ اَعْطٰى وَالرَّحِيْمُ اِذَا لَمْ يُسْاَلْ يَغْضِبُ (تفسیر ابن کثیر ۱:۲۰)

رحمٰن وہ ہے کہ جب بھی اس سے مانگا جائے عطا کرتا ہے اور رحیم وہ ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔

رحمانیت کا یہ معنی مزید کسی دلیل کا محتاج نہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ کی شان ہی یہ ہے کہ جب بھی کوئی اس کی بارگاہ میں دامن سوال پھیلاتا ہے وہ ذات اسے نامراد واپس نہیں لوٹاتی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَ اٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ۔ (ابراہیم، ۱۴: ۳۴)

اور اس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرما دی جو تم نے اس سے مانگی۔

ضرورت اور طلب پر عطا کرنا تو اس کی شان رحمانیت میں تھا ہی ورنہ اس کے بغیر اس حکم کا بھی کوئی جواز نہ تھا کہ

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔ (البقرہ، ۲: ۱۸۶)

میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے۔

لیکن رحیمیت اس کی رحمت کے ایک اور تقاضے کو اجاگر کر رہی ہے کہ اس ذات کی سخاوت اور اپنے بندوں کے لئے شفقت وعنایت کا عالم یہ ہے کہ اگر کوئی اس سے سوال نہ کرے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے یعنی اس کی عطا اور رحمت ہمہ وقت سائل کی تلاش میں ہے۔ اقبال کا یہ شعر رحمت حق کے اس پہلو کو خوب اجاگر کرتا ہے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہرو منزل ہی نہیں

حضرت ابوہریرہؓ سے اسی مفہوم کی ایک حدیث مروی ہے۔

میں تو دعا مانگنے والے کی التجاؤں کو جب وہ مجھ سے دعا مانگے قبول کرتا ہوں پس (بندوں کو بھی) چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ من لم یسال اللہ یغضب علیہ

(جامع ترمذی، ۲: ۱۷۳)، (ابن ماجۃ، ابواب الدعوات)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ کو اس پر غضب آتا ہے۔

یہ اس کی شان کریمی کی انتہا ہے۔ اگر وہ ذات ترک سوال پر ناراض ہوتی ہے تو یقیناً کثرت سوال پر زیادہ خوش ہوتی ہو گی۔ لیکن انسانوں کی عطا کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر ان سے زیادہ مانگا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں بلکہ دینے کے بجائے انہیں اس بات پر خوشی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص زیادہ دیر تک حاجت مندی میں مبتلا رہ کر اس کے دروازے کے چکر لگاتا رہے اور مسلسل احساس محرومی کا شکار رہے مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کا مانگنا اور اسے اس کا عطا کر دینا خوش کرتا ہے، بقول شاعر

اللہ یغضب ان ترکت سوالہ
و بنی ادم حین یسال یغضب

الرحمٰن الرحیم...... دونوں کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد

الرحمٰن اور الرحیم کے معنوی امتیازات کو سمجھنے کے بعد ان دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد از خود واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم یہاں تلخیص کی صورت میں اس امر پر مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کیونکہ ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ''رحمٰن'' ''رحیم'' کی نسبت زیادہ مبالغے کے ساتھ رحمت پر دلالت کرتا ہے۔

مستزاد یہ کہ لفظ ''رحمٰن'' میں لفظ ''رحیم'' کے مقابلے میں زیادہ حروف استعمال ہوتے ہیں اور عربی ادب کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ زیادتی حروف زیادتی معنی پر بھی دلالت کرتی ہے۔ یعنی زیادہ حروف پر مشتمل الفاظ اسی معنی میں کم حروف پر مشتمل الفاظ کے مقابلے میں زیادہ معنوی وسعت رکھتے ہیں' لہٰذا اس کی ضرورت کیوں ہوگی کہ ایک ایسے وصف یعنی ''الرحمٰن'' کو جو زیادہ رحمت پر محیط ہے پہلے بیان کر دینے کے بعد پھر دوسرے وصف یعنی ''الرحیم'' کو جو اس کے مقابلے میں کم دائرے کو حاوی ہے بیان کیا گیا اور اگر دونوں کو ہی بیان کرنا مقصود تھا تو اس ترتیب تقدیم وتاخیر کے ساتھ کیوں؟

۱۔ رحمٰن و رحیم دونوں کو اکٹھا بیان کرنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ذات حق میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ ہر چند کہ رحمان' رحیم کے مقابلے میں زیادہ معنی رحمت پر دلالت کرتا ہے لیکن یہاں یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ذات کثرت کے ساتھ صفت رحمت کی حامل تو ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ وہ رحمت اس سے اسی قدر فعلاً بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں تو رحمٰن کے بعد رحیم کے لفظ نے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ ہستی باری تعالیٰ کی رحمت محض اس کی صفت اور حالت ہی نہیں بلکہ ہر لحہ عالم وجود اس کی رحمت سے بالفعل فیضیاب بھی ہو رہا ہے۔

۲۔ دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ رحمانیت کی عمومی رحمت جو جمیع خلق کو بلا استثنٰی محیط ہے' مومن و کافر دونوں کے لئے یکساں ہے اس یکسانیت کے پیش نظر کہیں مومنین و متقین مایوس نہ ہو جائیں کہ اگر کفار و مشرکین بھی ہمارے برابر حصہ رحمت پائیں گے تو ہمیں اطاعت و غلامی حق کا کیا صلہ ملا۔ اس سوال کا جواب پہلے ہی دے دیا گیا کہ بیشک سب مخلوق بلا امتیاز رب کائنات کے چشمہ رحمانیت سے فیضیاب ہو رہی ہے لیکن مومنین و متقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحیمیت کی بارگاہ سے خصوصی رحمت کا اہتمام بھی کر رکھا ہے۔

۳۔ اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ شان رحمانیت کے بیان سے وجود و بقا اور کمال کے ہر مرحلے پر رحمت حق کے میسر آنے کا وعدہ تو ہو گیا تھا' لیکن گناہگار و خطاکار پریشان تھے کہ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور اپنی ہی بقا و کمال کے خلاف کوئی عمل صادر کر بیٹھیں تو کہیں رحمت حق کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ بارگاہ رحیمیت سے ندا آئی کہ نہیں نہیں' خطاکاروں کے لئے بھی رحمت حق نے اپنی بخشش و مغفرت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ وہ ذات معاف کر کے اپنی رحمت

بحال رکھے گی صرف اس سے صفائی قلب کے ساتھ معافی مانگنا درکار ہے' بلکہ اس کی رحمت خلوص نیت کے ساتھ معافی مانگنے والے گناہگار کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ پرہیزگاروں کے مقابلے میں زیادہ ضرورت مند ہوتا ہے۔ سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مکشوفات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اهل الطاعات يذكرون النعيم و اهل العصيان يذكرون الرحيم

عبادت کرنے والے جنت کو یاد کرتے ہیں اور گناہگار رب کی رحمت کو یاد کرتے ہیں۔

(الرسالۃ غوث الاعظم: ٦٠)

ایک اور مقام پر ارشاد منقول ہے۔

انا اقرب الى العاصى اذا فرغ من العصيان

جب گناہگار گناہ سے دور ہو جاتا ہے تو میں اس کے زیادہ قریب ہو جاتا ہوں۔

(الرسالۃ غوث الاعظم: ٦٢)

۴۔ دونوں اوصاف کو اکٹھا کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ شان رحمانیت چونکہ بندوں کو زیادہ تر دنیا میں رحمت سے نوازنے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ اس لئے اس سے کہیں بندے یہ تاثر نہ لیں کہ آخرت میں جب **لمن الملک اليوم لله الواحد القهار** (غافر، ۴۰: ۱۶)'' کہ آج کس کی بادشاہی ہے۔ اللہ کی' جو ایک ہی قہر والا ہے'' کا اعلان ہوگا تو ہم کہاں جائیں گے۔ کیونکہ رحمت حق کے بغیر تو کسی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا چنانچہ شان رحیمیت نے انسانوں کو اس مایوسی سے بچالیا کہ تم خود کو آخرت کے لئے تیار کرو رحمت حق وہاں بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ کیونکہ رب ذوالجلال صرف رحمٰن الدنیا' ہی نہیں رحیم الاخرہ بھی ہے۔

۵۔ دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنا اس وجہ سے بھی تھا کہ لوگ آداب بندگی سے بہرہ ور ہو جائیں کیونکہ رحمانیت کی شان یہ تھی کہ ذات حق اپنے بندوں کو ہر وہ چیز عطا کرتی رہے۔ جس کی انہیں ضرورت اور طلب ہو اور بغیر مانگے بھی عطا کرنا رحمانیت کا تقاضا تھا۔ اس بے پایاں عطا سے لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ جب سب کچھ از خود مل جاتا ہے تو اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ رحیمیت باری نے بنی نوع انسان کو متنبہ کر دیا کہ از خود عطا کرنا میری شان ہے مگر مجھ سے مانگنا تمہارا فرض ہے۔ اگر مجھ سے نہیں مانگو گے تو میری ناراضگی کے مستحق ٹھہرو گے۔ میں تمہیں دیتا رہوں اور تم ہر گھڑی مجھ سے مانگتے رہو۔ اس طرح رحمانیت و رحیمیت کی دونوں شانوں کے ظہور سے تمہارا تعلق بندگی پختہ ہوگا اور مجھے دینے میں خوشی ہوگی۔

٦۔ دونوں اسماء کا یکے بعد دیگرے بیان کرنا اس وجہ سے بھی تھا کہ رحمت حق کے امیدوار و طلب گار مطمئن رہیں کہ اس کے خزانہ رحمت میں کوئی کمی نہیں۔ جس طرح وہ اپنی صفت رحمت کو بار بار مختلف عنوانات کے تحت بیان کر رہا ہے اسی طرح وہ ضرورت مندوں پر ان کے

حسب حال رحمت بھی بار بار کرے گا۔ اس کی رحمت مختلف صورتوں میں مسلسل ہوتی رہے گی۔ مبرد کا قول اسی امر کی تائید کرتا ہے کہ ''ھوانعام بعد انعام وتفضّل بعد تفضّل'' یہ ان حکمتوں میں سے چند ایک تھیں جن کی بنا پر خالق کائنات نے خود کو بیک وقت الرحمٰن کے وصف سے بھی متعارف کرایا اور الرحیم کے وصف سے بھی۔

صفت رحمت کی تخصیص کیوں؟

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ باری تعالیٰ لاتعداد صفات وکمالات سے بہرہ ور ہے اور ہر لمحہ کائنات میں اس کی مختلف صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔

وہ خالق و مالک بھی ہے رب و مستعان بھی، علیم وخبیر بھی، سمیع و بصیر بھی، حفیظ وجلیل بھی ہے علی وکبیر بھی، لطیف وحلیم بھی ہے، عزیز وجبار بھی ہے، مجید وقہار بھی، شہید وحمید بھی ہے، حی وممیت بھی، قوی وقیوم بھی ہے اور رشید وصبور بھی۔ الغرض وہ ذات ''**کل یوم ھو فی شان**'' کی مصداق ہے۔ ہمہ وقت اس کے اوصاف وافعال اس کی ہستی کی مختلف شانوں کو اجاگر کر رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تسمیہ میں شان الوہیت کو جن دو اوصاف سے متصف کیا گیا وہ دونوں شان رحمت پر مبنی تھے۔ دیگر اوصاف وکمالات الٰہیہ میں سے کسی اور کو کیوں نہ منتخب کیا گیا؟ صرف صفت رحمت کی تخصیص کس مصلحت پر مبنی تھی۔

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات وکمالات میں سے رحمت، ایک ایسی صفت ہے جو اس کی تمام شانوں، حیثیتوں اور اوصاف وافعال پر محیط ہے۔ یعنی اس کی کوئی صفت اور کوئی فعل بھی رحمت سے خالی نہیں۔ اور یہی ان ارشادات ربانی کا معنی ہے۔

رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ۔ تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے۔

(الانعام، ۶: ۱۴۷)

وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ اور میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے۔

(الاعراف، ۷: ۱۵۶)

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا۔ ہمارا رب جس کی رحمت اور علم ہر شے پر حاوی ہے۔

(غافر، ۴۰: ۷)

جس طرح کائنات میں رونما ہونے والی کوئی حرکت علم الٰہی سے خارج نہیں ہو سکتی اسی طرح کائنات میں صادر ہونے والا کوئی امر بھی رحمت الٰہی سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس ذات سے جس صفت اور فعل کا بھی ظہور ہو گا وہ خلق کے حق میں بہرصورت رحمت ہو گا خواہ مخلوق خدا اپنی دانست میں اسے رحمت سمجھے یا نہ سمجھے۔ چونکہ ہر فعل الٰہی اور وصف ربوبیت کی اصل اور حقیقت

رحمت ہی تھی۔ اس لئے اسی کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا اور باقی صفات و کمالات کا لفظاً ذکر نہ کیا گیا۔ جب الرحمٰن اور الرحیم دونوں اسماء کی معنوی وسعتوں نے رحمت الٰہیہ کی ہر نوع، ہر درجہ اور ہر شکل و صورت کو بیان کر دیا تو ذات حق کی تمام صفتی اور فعلی شانیں از خود بیان ہو گئیں۔ الگ الگ نام لے کر مزید کسی کا بیان کیا جانا ضروری نہ رہا۔ اگر یہاں یہ گمان پیدا ہو کہ زندگی میں صرف راحتیں ہی نہیں ہوتیں ہزاروں دکھ اور آزار مصائب و آلام اور آفات و شدائد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر ان پریشانیوں اور تکلیفوں کو کیوں رحمت تصور کر لیا جائے اور اگر انسانی زندگی کے یہ پریشان کن افعال بھی مشیت الٰہی کے باعث ہیں تو پھر اسے ہر حال میں رحمان و رحیم کیسے مان لیا جائے۔ اس الجھن کو صحیح طور پر حل کرنے کے لئے رحمت کے معنی و مفہوم اور رحمت باری تعالیٰ کے حقیقی و واقعی تصور کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

رحمت کا معنی و مفہوم

رحمت عام طور پر مہربانی کو کہتے ہیں، لیکن اس کا اصل معنی بھلائی اور احسان کے لئے کسی کی طرف دل کا جھکنا اور نرم ہونا ہے۔ آئمہ لغت اور علماء و محققین نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے۔

الرحمة رقة تقتضی الاحسان الی المرحوم

رحمت دل کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جو کسی پر احسان کا تقاضا کرے۔

(المفردات: ۱۹۱)

قاضی بیضاویؒ اسی معنی کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

الرحمة رقةالقلب والانعطاف یقتضی التفضل والاحسان

(البیضاوی، ۱: ۶۵)

رحمت درحقیقت اس کیفیت کا نام ہے جو دل پر رقت اور نرمی کی صورت میں پیدا ہوتی ہے اور کسی مستحق کی طرف بھلائی اور احسان کے ساتھ پیش آنے کا تقاضا کرتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ رحمت دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک دل کی نرمی و رقت اور دوسرے فضل و احسان۔ یہاں ایک نکتہ انتہائی اہم ہے کہ رقت قلب اور ارادہ احسان دونوں تبھی ممکن ہیں کہ خارج میں کوئی فرد پریشان اور خستہ حال موجود ہو۔ اس کی پریشانی، تکلیف اور خستہ حالی دیکھی نہ جا سکے۔ اس کی حالت دیکھتے ہی دیکھنے والے کے دل میں اس کے لئے ایسی نرمی، رقت اور ہمدردی پیدا ہو جو اس پر احسان کرنے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کا سبب بن جائے، اسی قلبی کیفیت کا نام جو بالآخر فعل احسان پر منتج ہوتی ہے ''رحمت'' ہے۔ لیکن بہرصورت اس رحمت کا محرک کسی کی پریشانی، خستہ حالی یا ضرورتمندی ہوتی ہے۔ لہذا مصائب و آلام جو ظاہراً رحمت کے

منافی معلوم ہوتے ہیں، فی الحقیقت چھپے ہوئے جذبہ رحمت کے جوش میں آنے اور اس کے بالفعل صادر ہونے کا حقیقی سبب بن جاتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ جب رحمت رحیم کی اس صفت اور فعل کا نام ہے جس کا ظہور وصدور کسی مصیبت زدہ کی ایسی تکلیف کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جس کا ازالہ اس رحمت کا مقصد ہو تو پھر ایسی تکلیف یا مصیبت کو مطلقاً منافی رحمت کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔ جو حالت خود رحمت کے ظہور اور صدور کا باعث ہو، زحمت نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ کیفیت اور حالت جسے آپ بعض ظاہری عوارض کی بنا پر مصیبت اور تکلیف سمجھ رہے ہیں، موجود نہ ہوتی تو اس کے ازالے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر ایسے نہ ہوتا تو صاحب رحم، شفقت وعنایت اور فضل واحسان کے ارادے کے ساتھ کبھی بھی بالالتزام متوجہ نہ ہوتا اور اس خصوصی شفقت واحسان کے بغیر کوئی وجود پروان نہ چڑھتا، کسی کو کمال نصیب نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ اسی کیفیت کے باعث ہے جسے آپ نے زحمت سمجھا لیکن وہ درحقیقت رحمت کی ضرورت تھی۔ کم فہمی، عاقبت نا اندیشی اور ظاہر بینی کی بنا پر ان عوارض وکیفیات کو منافی رحمت تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شیر خوار بچہ بھوک کی شدت محسوس کر کے روتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، چیختا اور چلاتا ہے۔ اس کی دانست میں یہ وقت یقیناً سخت، تکلیف اور مصیبت کا وقت ہوگا جس کا اظہار اس کی ظاہری حالت سے بھی ہو رہا ہے لیکن اس ناسمجھ کو کیا خبر کہ اس کی یہی حالت، احساس اور ردعمل جسے وہ اپنے حق میں زحمت تصور کرتا ہے حقیقت میں اس کے لئے رحمت ہے۔ جس نے اس کی ماں کو شفقت ومحبت کے ارادے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ کر دیا اور اس نے اسے سینے سے لگا کر نہ صرف اس کے ظاہری عوارض کو دور کر دیا بلکہ اس کی صحت وتندرستی اور پرورش کی تکمیل کا باعث بھی ہو گئی۔

ذاتِ باری تعالیٰ اور مفہوم رحمت

رحمت کے متذکرہ بالا معنی ومفہوم کو سمجھنے کے بعد یہ امر وضاحت طلب ہے کہ جب رحمت ''رقت قلب اور ارادہ احسان'' کا نام ہے تو ذات باری تعالیٰ کے لئے اثبات رحمت کیسے جائز ہوا، کیونکہ وہ ذات تو دل کے جھکنے، نرم ہونے اور اس طرح کی تمام صفات حدوث سے پاک ہے۔ بے شک دل کا ہونا اور رقت ولرزہ ایسی کیفیات اس کی شان کے لائق نہیں لہٰذا ذات حق کی رحمت سے مراد فضل واحسان کے ساتھ کسی کی طرف اللہ تعالیٰ کا متوجہ ہونا ہوگا۔ کیونکہ رحمت کا اطلاق دونوں صورتوں پر ہو سکتا ہے ایک یہ کہ کسی کے لئے دل میں نرمی ورقت پیدا ہو یعنی اس پر بھلائی کرنے کا جذبہ اور خواہش دل میں موجزن ہو لیکن عملاً بھلائی اور احسان کر سکنے کی استطاعت نہ ہو۔ اس حالت میں احسان کا صدور تو نہیں ہو سکا لیکن دل رقت کے ساتھ احسان کرنے کی خواہش ضرور کرتا رہا۔ مخلوق میں بسا اوقات ایسی رحمت کی صفت پائی جاتی ہے۔ کئی انسان دل سے کسی کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے۔ یہ خوبی بھی بہر حال بلا اختلاف رحمت کہلاتی ہے۔

دوسری صورت رحمت حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہے کہ وہ ذات دل اور رقت وغیرہ سے پاک ہے۔ وہ جس پر رحم کرنا چاہتی ہے اس کی طرف فضل واحسان کے ارادے سے متوجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا مجرد ارادہ فضل واحسان سے باری تعالیٰ کے التفات وتوجہ کو اس کی رحمت کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ اسی امتیاز کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قد تستعمل تارة فی الرقة المجردة و تارة فی الاحسان المجرد عن الرقة نحو: رحم اللّٰہ فلانا' واذا وصف به الباری فلیس یراد به الا الاحسان المجرد دون الرقة و علی هذا روی ان الرحمة من اللّٰہ انعام و افضال ومن الادمیین رقة و تعطف و علی هذا قول النبی ﷺ ذاکرا عن ربه انه لما خلق الرحیم قال له انا الرحمن و انت الرحیم' شققت اسمک من اسمی فمن وصلک وصلته و من قطعک بتة'' فذالک اشاره الی ما تقدم و هو ان الرحمة منطویة علی معنیین: الرقة والاحسان فرکز تعالی فی طبائع الناس الرقة و تفرد بالاحسان"

(المفردات:۱۹۱)

مذکورہ بالا تصریح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ مخلوقات عالم پر محض فضل واحسان کے ارادے سے متوجہ ہونا باری تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمیت ہے۔ اور رقت قلب کے ساتھ کسی پر احسان کے ارادے سے متوجہ ہونا انسانوں کی رحیمیت ہے۔

رحمت حق کا حقیقی تصور

رحمت حق کے حقیقی تصور کو اس کی آفاقیت کے حوالے سے جانا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پوری کائنات میں کارفرما نظام قدرت کا ایک ایک گوشہ رحمت باری تعالیٰ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ عالم ہستی میں ظہور پذیر ہونے والے احوال وواقعات کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جو درحقیقت رحمت حق پر دلالت نہ کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات نے اپنی ذات کی نسبت واضح طور پر لزوم رحمت کا حکم صادر فرمایا۔

كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ۔
(الانعام ۶:۱۲)

اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم فرما لی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ۔
(الانعام ۶:۵۴)

آپ (ان سے شفقتاً) فرمائیں کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمہ کرم) پر رحمت لازم کر لی ہے۔

لزوم رحمت کے اس واشگاف اعلان کے بعد اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ

افعال الٰہی میں سے کوئی بھی فعل خلاف رحمت ہو خواہ وہ ظاہرا عذاب ہی کیوں نہ دکھائی دے رہا ہو۔ اس لحاظ سے کائنات ہست و بود پر نظر ڈالی جائے تو رحمت الٰہی کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ ''حسی رحمت اور معنوی رحمت'' جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وَ اَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً۔ (لقمان، ۳۱:۲۰)	اور اللہ نے تم پر حسی و ظاہری طور پر بھی اور معنوی و باطنی طور پر بھی اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔

رحمت حق کی حسی صورت

اس سے مراد حیات انسانی کے وہ اوصاف و احوال ہیں جو ظاہراً و شکلاً ہر ایک کو رحمت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی افادیت میں کسی کو شک نہیں اور ہر وجود بلا امتیاز رب العالمین کی ان کھلی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہ باری تعالیٰ کے وہ ظاہری انعامات و احسانات ہیں جن کا کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ آپ انسانی خلقت کے اندر غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ باری تعالیٰ نے انسان کو عالم آب و گل میں وجود عطا کر کے اس دنیا کی رنگینیوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کتنی جسمانی نعمتوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس نے انسان کو سب سے پہلے ایک متوازن اور معتدل اعضا پر مشتمل ایسا خوبصورت وجود بخشا جسے تمام حسی مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ٥ (التین، ۹۵:۴)	بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان دیگر جاندار مخلوقات کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے اپنے برتر ہونے کا بخوبی علم ہے۔ اسے آنکھیں عطا کیں کہ نظارہ فطرت سے لطف آشنا ہو سکے ورنہ مناظر حسن و جمال کی لذتوں سے نا آشنا رہتا۔ اسے کان عطا کئے کہ وہ سن سکے ورنہ صوتی احساسات سے نابلد ہو کر اس کی زندگی کا آدھا حسن جاتا رہتا۔ پھر اسے دل و دماغ عطا کیے کہ سوچ سکے اور جذبات کا حامل ہو سکے۔ ورنہ شعوری اور لاشعوری فیصلوں کی صلاحیت سے محروم ہوتا۔ ان نعمتوں کا ذکر قرآن اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے۔

وَاللهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَo

(النحل،١٦:٧٨)

اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے (اس حالت میں) باہر نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم شکر بجا لاؤo

اسی طرح رات اور دن کے امتیاز کو بھی انسان کے لئے رحمت بنا دیا۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَo

(القصص،٢٨:٧٣)

اور یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن الگ الگ بنا دیئے۔ تا کہ تم رات کے وقت راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبارِ معیشت میں سرگرم رہو) تا کہ تم خدا کی نعمتوں کا شکر بجا لاسکو۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشَاتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشَاتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ۔

(الانعام،٦:١٤٢)

اور وہی ہے جس نے برداشتہ اور غیر برداشتہ (یعنی بیلوں کے ذریعے چڑھائے گئے اور بغیر اوپر چڑھائے گئے) باغات پیدا فرمائے اور کھجور (کے درخت) اور زراعت جس کے پھل گونا گوں ہیں اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (ذائقہ میں) جداگانہ ہیں (بھی پیدا کئے)۔

انسانی زندگی میں ازدواجیت کو بھی ایک خاص قسم کے سکون اور لطف کا باعث بنا دیا، ارشاد ہوتا ہے۔

www.MinhajBooks.com

وَمِنْ اٰيَاتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً۔
(الروم۳۰:۲۱)

اور یہ بھی اس کی رحمت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہیں میں سے جوڑے (یعنی مرد اور عورت) پیدا کر دیئے تا کہ تم ایک دوسرے سے سکون پاؤ اور پھر اس نے تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔

قرآن نے ایک اور مقام پر کائناتی سطح پر موجود حسی رحمتوں کا بیان اس طرح کیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْاَنْهَارِO لَكُمُ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنَّهَارَO الَّيْلَ
وَاٰتٰكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌO
(ابراہیم ۱۴:۳۲-۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان کی جانب سے پانی اتارا پھر اس پانی کے ذریعہ سے تمہارے رزق کے طور پر پھل پیدا کئے اور اس نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کر دیا تا کہ اس کے حکم سے سمندروں میں چلتی رہیں اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو (بھی) مسخر کر دیا اور اس نے تمہارے (فائدہ) کے لئے سورج اور چاند کو (باقاعدہ ایک نظام کا) مطیع بنا دیا جو ہمیشہ (اپنے اپنے مدار میں) گردش کرتے رہتے ہیں اور تمہارے (نظام حیات) کے لئے رات اور دن کو بھی (ایک) نظام کے تابع کر دیا اور اس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرما دی جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو (تو) پورا شمار نہ کر سکو گے بے شک انسان بڑا ہی ظالم بڑا ہی ناشکر گزار ہےO

باری تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بعض حسی صورتوں کو گنوا کر بالآخر یہ کہہ دیا کہ کس کس رحمت کا ذکر کیا جائے۔ یہ سلسلہ تو کوئی حد و انتہا ہی نہیں رکھتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ انسان کو اپنی زندگی کی جملہ آسائشوں اور لذتوں کے لئے جو کچھ مطلوب تھا خواہ اسے اس کا شعور بھی تھا یا نہیں ہم نے بغیر اس کے مانگے اسے سب کچھ مہیا کر دیا۔ لہٰذا کائنات ارض و سما کی وسعتوں میں جس طرف چاہو

نگاہ اٹھا لو اس کی رحمت کے نظارے نکھرے ہوئے نظر آئیں گے چونکہ خدا کی رحمتیں ہر قدم پر فراوانی کے ساتھ انسان کو میسر ہیں اس لئے اسے ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔

رحمتِ حق کی معنوی صورت

مذکورہ بالا گفتگو سے رحمتِ حق کی حسی صورت واضح ہو چکی ہے راحتیں تو رحمتِ حق کی حسی صورتیں تھیں ہی مگر زندگی کی تکلیفیں بھی اس کی رحمت کی معنوی صورتیں قرار دی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کارگہ حیات میں کوئی بھی شئے زحمت نہیں۔ انسان کو کیا خبر کہ پانی کتنی بڑی نعمت ہے اس کا اندازہ تو صرف اسی کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی پیاس کی شدت محسوس کی ہو۔ اسے کیا خبر کہ دھوپ کتنی بڑی نعمت ہے اس کا علم تو انہیں لوگوں کو ہے جو موسمی اثرات کی وجہ سے عرصہ دراز تک سورج کی کرن کو ترستے ہیں۔ اسے کیا خبر کہ نیند کتنی بری نعمت ہے اس کا اندازہ ان سے پوچھو جو بدقسمتی سے معذور ہو گئے ہوں یا جسمانی صحت سے محروم ہوں۔ مختصر یہ کہ ظلمت کے بغیر دن کا، بیماری کے بغیر صحت کا، دھوپ کے بغیر سائے کا، سفر کے بغیر حضر کا، گمراہی کے بغیر ہدایت کا، باطل کے بغیر حق کا اور شر کے بغیر خیر کا، یعنی تضاد کے بغیر کسی حقیقت کی اصل افادیت کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مگر انسان کتنا بے انصاف اور احسان فراموش ہے کہ اسے نعمت ملے تو کبھی شکر ادا نہیں کرتا اور محروم ہو جائے تو بھی نعمت کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔

(ا) تکلیف برائے احساسِ رحمت ہے

تکلیفوں کا رحمت ہونا دو طرح سے ہے۔ ایک اس طرح کہ تکلیف کے بغیر نعمت کی لذت، لذت نہیں رہتی۔ تکلیفیں نہ ہوں تو نعمت و راحت انسانی زندگی کے لئے کسی بھی خصوصی لطف کا باعث نہ رہیں۔ یہ تکلیفیں ہی ہیں جو حیاتِ انسانی کو لذت آشنا کر دیتی ہیں۔ اور دوسرے اس طرح کہ راحت کے بالمقابل تکلیف کے وجود سے نہ صرف راحت اپنا صحیح مقام حاصل کرتی ہے بلکہ زندگی بھی اسی اتار چڑھاؤ سے صحیح زندگی قرار پاتی ہے۔ اگر یہ حرکت نہ ہو اور زندگی میں ایک ہی حالت کار فرما ہے تو اس میں اور موت میں کیا فرق باقی رہے گا۔ کیونکہ راحت و تکلیف دونوں کے لزوم کے بغیر نہ زندگی کا کوئی مقصد باقی رہتا ہے نہ جد و جہد کا وجود۔ اس بزمِ حیات کی گرمی اور رونق، راحت و تکلیف دونوں کے دم قدم سے ہے۔ اگر ایک عنصر کلیتاً ختم ہو جائے تو زندگی سوائے جمود و تعطل کے کچھ باقی نہ رہے۔ زندگی تو نام ہی سعی پیہم اور جہد مسلسل کا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان راحتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اگر تکلیف کا وجود باقی نہ رہے اور صرف راحت ہی راحت ہو تو پھر سعی و کاوش کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ آپ روزمرہ کے معمولات میں بھی اس امر کا اندازہ لگاتے ہوں گے کہ اگر کرنے کا کوئی کام نہ ہو، بالکل فراغت ہو تو انسان بیٹھا بیٹھا اکتا جاتا ہے۔ حتی کہ وہ وقت گزارنے کے لئے خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ

بے مقصدیت اور جمود وتعطل زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہنے دیتے۔ اصل لطف کسی لذت کو پانے کی آرزو اور اس کی کوشش میں ہے۔ جو لذت بغیر محرومی کے اور بغیر آرزو کے اور بغیر کوشش کے از خود میسر آ جائے وہ درحقیقت لذت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس خلاق اعظم نے حیات انسانی کے لئے لاکھوں نعمتوں اور راحتوں کو پیدا کیا تاکہ انسان اس سے لذت وسکون حاصل کرے اور اگر ان کے بالمقابل مصائب وآلام اور شدائد وتکالیف کے عوارضات سرے سے پیدا ہی نہ کرتا تو کوئی راحت، راحت نہ رہتی اور کوئی لذت، لذت نہ ہوتی۔ چنانچہ اس نے راحت اور اس کی گونا گوں لذتوں کو صحیح مقام دینے کے لئے زندگی میں تکلیفیں بھی پیدا کر دیں تاکہ ان تکلیفوں سے گزر کر انسان جب راحتوں کی منزل تک پہنچے تو اسے وہی لطف محسوس ہو جس کی اسے تلاش تھی۔ اس لئے راحتیں حسی رحمت اور تکلیفیں معنوی رحمت۔ تاکہ انسان کو نعمت بھی ملے اور اس کا صحیح لطف ولذت بھی ...... اس امر کی وضاحت میں ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو۔

یُسْرًا o اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا o	یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔ یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔

(الانشراح، ۹۴: ۵۔۶)

(۲) تکلیف وجہ التفات رحمت ہے

جیسا کہ ''رحمت کے معنی ومفہوم'' کے عنوان کے تحت پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر تکلیف اس وجہ سے معنوی رحمت ہے کہ وہ رحمت وعنایت اور فضل واحسان کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ رحمت کا صدور ضرورت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کسی کا تکلیف میں مبتلا ہونا رحمت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے تکلیف منافی رحمت نہیں بلکہ سبب رحمت قرار پاتی ہے۔ بسا اوقات تکلیف کے ظاہری عوارض کو دیکھ کر انسان پریشان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں خدا جانے کس وجہ سے مبتلاء زحمت ہوں لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی یہی حالت استحقاق رحمت کی بنیاد ہے۔ جس طرح موت نئی زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ رات کا اندھیرا نئے دن کے اجالے کی خبر لاتا ہے اور ہر شام نئی صبح کی اساس بنتی ہے۔ اس طرح ہر تکلیف نئی راحت ونعمت کا باعث بنتی ہے۔ دریائے رحمت کسی کو غمزدہ اور گرفتار مصیبت دیکھ کر اتنا جوش میں آتا ہے کہ اس کی بہتری اور بھلائی کی ہزاروں نئی صورتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جس کا اسے گمان تک نہیں گزرتا۔ لہٰذا تکلیف اس وجہ سے معنوی رحمت قرار پائی کہ وہ صاحب رحمت کی شفقت والتفات کو پہلے سے بھی زیادہ ارادہ احسان کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے، کسی پریشان حال کے رونے کو مسکراہٹ میں بدل کر ذات رحمٰن ورحیم کو اتنی مسرت ہوتی ہے کہ شاید اس قدر کسی اور پر رحم کرنے سے نہیں۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے مکشوفات میں بیان فرماتے ہیں کہ

قلت یا رب ای ضحک افضل عندک؟ قال ضحک الباکین
(الرسالۃ غوث الاعظم' ۷۱)

پرودگار! کونسی ہنسی تیرے نزدیک اچھی ہے اللہ نے فرمایا۔ رونے والوں کی ہنسی"

اسی طرح ایک اور مقام پر آپؒ نے باری تعالی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

جعلت الفقر والفاقۃ مطیۃ الانسان فمن رکبھا فقد بلغ المنزل قبل ان یقطع البوادی
(الرسالۃ غوث الاعظم: ۴۰)

میں نے فقروفاقہ کو انسان کے لئے بہترین سواری بنایا ہے۔ جو کوئی اس پر سوار ہو گیا وہ راستے طے کئے بغیر منزل تک پہنچ گیا۔

مولانا رومؒ اس تصور کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آذر است
دل گزرگاہ جلیل اکبر است

اصحاب صفہ کی فقر فاقہ اور مشقت سے بھرپور زندگی کا ایک پہلو ملاحظہ ہو۔

کان اذا صلی بالناس یخر رجال من قامتھم فی الصلوہ من الخصاصۃ و ھم اصحاب الصفۃ حتی یقول الاعراب ھولاء مجانین فاذا صلی رسول اللہ انصرف الیھم فقال لو تعلمون ما لکم عند اللہ لاحببتم ان تزدادوا فاقہ
(جامع ترمذی' ابواب الزھد ن رسول اللہ ﷺ' ۲:۵۹)

فقر وفاقہ کے باعث ان کی کمزوری اور نقاہت کا یہ عالم تھا کہ نماز میں کھڑے ہوتے تو گر پڑتے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر اعرابی انہیں دیوانہ کہتے تھے۔ جس پر رسول خدا ﷺ نے ان سے فرمایا اگر تمہیں یہ علم ہو جائے کہ ان کی اس حالت زار کا مقام بارگہ الوہیت میں کیا ہے تو تم بھی بکثرت فاقہ اختیار کرنے کو پسند کرو۔

لہٰذا وہ حالت جو خود رحمت الٰہی کا استحقاق پیدا کردے' بندے کے حق میں زحمت نہیں ہوسکتی۔

(۳) تکلیف خود تادیبی رحمت ہے

تکلیفوں اور پریشانیوں کا معنوی رحمت ہونا بایں وجہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات انسان

کے لئے عبرت واصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک چیز بادی النظر میں رحمت معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کی حقیقت اور انجام کو دیکھا جائے تو وہ بھی رحمت ہوتی ہے۔ مثلاً اولاد یا شاگرد کی خطا پر از راہ تعلیم وتادیب اس کو مارنا ظاہراز حمت اور تکلیف معلوم ہوتا ہے مگر یہ بھی فی الواقع رحمت ہے کیونکہ اس بچے پر احسان یہی ہے کہ اسے بری عادات سے بچایا جائے۔ خطا کاری اور بداعمالی سے محفوظ کر کے اس کی صحیح تربیت کی جائے۔ اگر اس سزا سے وہ بچہ برے انجام سے بچ جائے تو کیا یہ سزا اس کے لئے زحمت ہوئی یا رحمت؟

اگر اسے سزا نہ دی جاتی۔ پیار کیا جاتا اور اسے غلط راستے پر بدستور گامزن رہنے دیا جاتا تو انجام کار وہ نہ صرف اپنی تباہی و ہلاکت کا باعث ہوتا بلکہ معاشرے کے دوسرے افراد بھی اس کی بدکرداریوں کے منفی اثرات سے متاثر ہوتے اور ان کے لئے اس کا عمل اذیت کا باعث ہوتا۔ چنانچہ تادیبی سزا جو اس وقت بادی النظر میں تکلیف اور زحمت معلوم ہو رہی تھی اس کے لئے بھی اور باقی معاشرے کے لئے رحمت بن گئی۔ اسی طرح حیات انسانی میں پیش آنے والے مصائب و آلام رب العالمین کی شان ربوبیت ہی کا ایک پہلو ہیں۔ انسان کو کیا خبر کہ ایک تکلیف نے جسے وہ زحمت سمجھ رہا ہے اسے کتنے برے انجاموں سے بچا لیا۔ بسا اوقات ایک حادثہ کسی انسانی زندگی کو ہمیشہ کے لئے سنوار دینے کا باعث ہو جاتا ہے لہٰذا رب رحمٰن اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت انسان کی بہتری کے لئے اسے مختلف حالتوں سے دوچار کرتا رہتا ہے۔ ہر حالت حقیقت میں اس کے لئے رحمت ہوتی ہے۔ مگر انسان کو بعض اوقات اس کا شعور نہیں ہوتا، قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

عَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔

(البقرہ، ۲: ۲۱۵)

اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لئے بہتر ہو اور (یہ بھی) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لئے بری ہو۔

انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جسے وہ تخریب سمجھ رہا ہے وہ بھی کسی تعمیر کا پیش خیمہ ہو گی۔ سونے پر بھٹی کی آگ سے گزرنے اور کٹھالی میں پگھلنے کا مرحلہ نہ آتا تو اسے خالصیت اور چمک دمک نصیب نہ ہوتی۔ لکڑی کا سینہ آرے میں نہ چرتا تو خوبصورت فرنیچر معرض وجود میں نہ آتا۔ مٹی بھٹے کی آگ میں نہ جلتی تو دیدہ زیب عمارات منصۂ شہود پر نہ آتیں۔ پتھروں کے وجود ریزہ ریزہ نہ ہوتے تو ہزاروں مصنوعات کی تخلیق نہ ہوتی ہیرے کے کونے نہ تراشے جاتے تو اس کی آب وتاب اور جلوہ ریزیاں نہ نکھر سکتیں۔ مالی درختوں اور پودوں کی شاخیں نہ کاٹتا تو باغ کا حسن نہ نکھر سکتا۔ الغرض کونسا کام دنیا میں ایسا ہے جس میں ظاہری تکلیف کے بغیر حسن وکمال نصیب ہو جاتا ہو۔ یہ سب احوال زندگی باری تعالیٰ کی رحمت کے پرتو ہیں خواہ حسی ہوں یا معنوی۔

بنابریں اللہ تعالیٰ نے بجائے اپنی دیگر صفات کے ذکر کے صفت رحمت کے ذکر کو منتخب فرمایا کیونکہ یہ اس کا ایسا وصف تھا جو ہر فعل میں جلوہ گر تھا۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا۔

www.MinhajBooks.com

باب٦

تسمیہ کی عملی حکمت وافادیت

www.MinhajBooks.com

اس سے قبل تسمیہ کا معنی، اس کے الفاظ کی تشریح وتوضیح اور متعلقہ احکام کا تفصیلی بیان ہو چکا ہے۔ آخر میں تسمیہ کے جملہ مطالب ومعارف کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خلاصہ صرف تسمیہ کی عملی حکمت وافادیت کے حوالے سے ہے۔ کیونکہ علمی وفکری مباحث نظم وضبط کے ساتھ پہلے درج ہو چکے ہیں انہیں دہرانا محض تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ یہاں ایک بات ضمناً واضح کر دوں کہ قرآنی مطالب ومعارف کا مطالعہ کرتے ہوئے دو امور اچھی طرح ذہن نشین رہنے چاہیں۔

مطالعہ قرآن سے متعلق دو اہم امور

ایک یہ کہ قرآن تمام نوع انسانی کی فکری اور عملی ہر دو طرح کی اصلاح کے لئے نازل ہوا ہے۔ اس لئے قرآن سے صرف فکری، نظریاتی اور اعتقادی اصلاح کی آرزو رکھنا اور عملی زندگی کی کامیابی کے لئے اس سے ہدایت اخذ نہ کرنا ایک اعتبار سے قرآن کی جامعیت وکاملیت کا انکار ہے۔ کیونکہ قرآن انسانوں کی عملی زندگی کو سنوارنے اور انہیں کارگہ حیات میں عملی کامیابیوں کی راہ دکھانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ اسلام اور فکر قرآن کا دم بھرنے کے باوجود اس کشمکش حیات میں عملی نتیجہ خیزی کے لحاظ سے قرآن کو حتمی وقطعی طور پر موثر اور فیصلہ کن ہدایت کا ضامن نہیں سمجھتے۔ اسے ان کی محرومی سمجھئے یا کوتاہ نظری، لیکن قرآن نہ صرف انفرادی اور قومی سطح پر عملی اصلاح کا پیغامبر ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی غلبہ حق کی صورت میں عملی کامیابی وکامرانی کا واضح اعلان کرتا ہے، مگر اس کی شرط ملت اسلامیہ کا قرآنی ہدایت پر علی وجہ البصیرت پختہ یقین، کامل اعتماد اور خلوص نیت کے ساتھ کاربند ہونا ہے۔

اسی امر کا دوسرا پہلو بھی ملحوظ رہے کہ قرآن کا مقصد انسانی سیرت وکردار کی اصلاح اور عملی رہنمائی کے ساتھ ساتھ فکری اور نظریاتی اصلاح بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حیات انسانی کی فکری اور نظریاتی الجھنوں کی خاطر انسان بجائے قرآن کے دوسرے فکری سرچشموں کے سامنے دامن مراد پھیلاتا پھرے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ۔

(النساء ۴: ۶۰)

(مگر) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمات (فیصلے کے لئے) شیطان (یعنی احکام الٰہی سے سرکشی پر مبنی قانون) کی طرف لے جائیں۔

ایسا اقدام کفر و طاغوت کے سامنے اپنی جبین نیاز کو سرنگوں کرنے کے مترادف ہو گا۔ خدائے بزرگ و برتر نے مسلمانوں کو اس طرح مخالف اسلام شیطانی قیادتوں کے سامنے ذلیل ورسوا ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا۝ (النساء، ۴:۶۰)	حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس کا (کھلا) انکار کر دیں اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں دور دراز گمراہی میں بھٹکاتا رہے۝

اب اگر کسی وقت بھی مسلم قیادت پر در بدر بھٹکنے کی حالت طاری ہو تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں ہے۔ لہٰذا تعلیمات قرآنی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ اہتمام قائم رہنا چاہئے کہ قرآن سے فکری اور عملی ہر دو طرح کی اصلاح میسر آئے کیونکہ قرآنی ہدایت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔

دوسرے یہ کہ قرآن کا خطاب ہر ذہنی سطح کے انسانوں سے ہے۔ ہر چند کہ اس کا نزول ایک خاص طرز و سطح کے معاشرے میں ہوا تھا۔ جس میں آنحضرت مقیم تھے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ اس کا خطاب بھی محض انہیں لوگوں سے یا انہی جیسی ذہنی سطح رکھنے والے لوگوں سے ہے اور مختلف النوع بلند پایہ علمی، فکری اور تحقیقی سطح کے حامل اذہان قرآن کے حلقہ خطاب سے خارج ہیں۔ یہ خیال قرآن اور اس کی تعلیمات کی عالمگیریت اور آفاقیت کے خلاف ہے۔ عصر حاضر میں بعض لوگوں نے قرآن کی نسبت یہ مغالطہ پیدا کیا ہے کہ ''قرآن کو دقیق علمی و فکری موضاعات ومسائل سے کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی اس کی تعلیمات میں باریک علمی و عقلی نکات کی گنجائش ہے۔ ایسا بیان تو محض تفسیری نکتہ آفرینیوں کا عمل ہے جو علماء نے اپنے طور پر قرآن کے نام سے وضع کر لیا ہے حالانکہ قرآن تو صرف سیدھی سادھی انسانی اصلاح کی بات کرتا ہے۔ یہ تصور مقاصد قرآن کی نسبت جزوی موقف ہے اور اس پر اصرار قرآنی مطالب وتعلیمات کی جامعیت اور ہمہ گیریت کا کھلا انکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غیر محدود پیمانے پر متفاوت ذہنی سطح کے لوگ موجود ہیں۔ ہر طبقے میں مختلف فکری قابلیتوں اور علمی صلاحیتوں کے حامل افراد پائے جاتے ہیں اور پھر انسانی فکر بھی بدستور ارتقاء کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اگر قرآن پوری نوع انسانیت کے لئے ہدایت ہے، تو اسے ہر ایک کی ذہنی سطح اور فکری معیار کے مطابق اپنا پیغام پہنچانا ہو گا۔ ہر ایک کی علمی ونظریاتی طلب کی تسکین کا سامان مہیا کرنا ہو گا۔ ہر ایک کی دینی، تحقیقی جستجو میں پیش آنے والی مشکلات کا حتمی حل میسر کرنا ہو گا اور ذہن انسانی میں ابھرنے والے ان تمام طبیعی اور مابعد الطبیعی سوالات کا حتمی وقطعی جواب دینا ہو گا۔ جنہیں آج تک انسان کے تراشیدہ عقلی علوم حل نہیں کر سکے اور انسان ان کے باعث ہزاروں قسم کی اعتقادی، نظریاتی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہے۔

آخر یہ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ اگر ایک عام انسان کا اعتقادی یا عملی مسئلہ حل طلب ہوتو قرآن اس کے لئے ہدایت مہیا کرے۔ لیکن عقل خرد کے وسیع صحراؤں میں حقیقت کی تلاش میں سرگرداں عقلاء ومفکرین اگر فکروعمل کی گمراہیوں میں مبتلا ہوں۔ انہیں اعلیٰ علمی دلائل وشہادات کے بغیر تسکین قلب میسر نہ آ سکتی ہواور وہ اپنی سطح وطلب ذہنی کے مطابق قرآن سے اپنے مسائل کا حل طلب کرنے کے لئے اس کا دروازہ کھٹکھٹائیں تو قرآن ان سے یہ کہہ کر معذرت کرے کہ ''میں تو صرف عام انسانوں کی سیدھی سادھی اصلاح کے لئے آیا ہوں۔ مجھے عقلاء ومفکرین عالم کی علمی وفکری جستجوؤں سے کوئی واسطہ نہیں'' اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ قرآن محض کم پڑھے لکھے لوگوں کے عام معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے اور زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنی مغالطّوں کا ازالہ اس کے بس کی بات نہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ایسا نقطہ نظر بھی وہی لوگ پیش کررہے ہیں جو اسلام کے مکمل نظام حیات اور قرآن کے جامع دستورزندگی ہونے کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اس سوچ کو فکری تضاد یا ذہنی التباس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام ذہنی سطح کے لوگوں سے لے کر کسی بھی بلند سے بلند تر ذہنی سطح کے افراد تک سب ہی قرآن کے مخاطب ہیں اور ہر ایک کی طلب وضرورت کے مطابق قرآن نے اپنی تعلیمات بہم پہنچائی ہیں۔

تسمیہ کی عملی حکمت وافادیت

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قرآنی معارف اپنے اندر علمی وفکری اور عملی وحقیقی دونوں طرح کی افادیت رکھتے ہیں تاکہ ضرورت مند کو اپنی طلب وجستجو کے مطابق قرآنی دولت میسر آسکے۔ اسی طرح تسمیہ بھی علمی وفکری حکمتوں کے علاوہ بے شمار عملی افادیت کے پہلو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔:

(ا) آداب گفتگو کی تعلیم

قرآن حکیم کی ہر سورت سے پہلے تسمیہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اور عبارت قرآن کا آغاز بھی انھی الفاظ سے ہوتا ہے بلکہ خود تسمیہ کے الفاظ پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان میں بھی باری تعالیٰ کے اسم مبارک کو پوری عبارت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ جس کی تفصیل ہم شروع میں ''حذف فعل کی حکمت'' کے عنوان سے بیان کرچکے ہیں۔ یہ تمام امور آداب گفتگو کے اس بنیادی اصول کی تعلیم دے رہے ہیں کہ مسلمان اپنی گفتگو کا آغاز ہمیشہ باری تعالیٰ کے مقدس نام سے کریں، تاکہ نہ صرف ان کی زبان وکلام میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو بلکہ ان کا مسلمان ہونا بھی ان کی گفتار سے پہچانا جائے۔ گویا تسمیہ انسان پر اسلام اور تعلق باللہ کا ایسا نقش دوام ثبت کرنا چاہتا ہے کہ اس کی گفتگو کا پہلا لفظ ہی اس کے عقیدہ ومسلک کا غماز ہو۔ یعنی اسلام کا منشا یہ ہے کہ

مسلمانوں کو ایسی انفرادیت اور تشخص حاصل ہونا چاہئے کہ دیگر امور تو درکنار وہ طریقہ گفتگو سے بھی ایک الگ قوم کی حیثیت سے نمایاں نظر آئیں۔ جہاں متعدد افراد تحریر و تقریر کے ذریعے اپنا اپنا مافی الضمیر بیان کررہے ہوں۔ وہاں کسی کو مسلمان کی بابت یہ سوال نہ کرنا پڑے کہ وہ کہاں ہے؟ وہ خود ہی اپنے طرز کلام اور انداز خطاب سے عیاں ہو جائے۔ گفتگو کا آغاز ہی خالق و مالک کے نام سے کرنا دراصل ذات حق پر کامل یقین اور عقیدہ توحید سے پختہ وابستگی پر دلالت کرتا ہے اس سے بحثیت مسلمان عقیدے کی صحت وحقانیت پر مکمل وثوق واعتماد کا اظہار ہوتا ہے اور اس طرح اس کی اسلامیت ظاہرا بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔

(۲) آداب معاشرت کی تعلیم

تسمیہ انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے تمام امور میں اسلام کا رنگ نمایاں کرنا چاہتی ہے، یہی روح دین ہے۔ اسلام اہل ایمان کو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں بحثیت مسلمان نبھا کرنے کی تلقین اس لئے کرتا ہے کہ عقیدہ اسلام کی چھاپ نہ صرف اس کی گفتار پر ہو بلکہ پورے کردار پر بھی نمایاں ہو سکے، قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔

(البقرہ، ۲:۲۰۸)

آنحضرت ﷺ نے تاکید وتکرار کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے ہونا چاہئے بلکہ جو کام بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے۔ یعنی برکت وفضیلت سے خالی ہوتا ہے۔ اسلام کے آداب معاشرت کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ مسلمان اپنے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کریں گویا باری تعالیٰ کے نام سے آغاز کرنا نہ صرف گفتگو کا شعار ہو بلکہ جملہ امور حیات میں پہلا قدم ہی اسی نام سے اٹھے۔ یہاں مسلمانوں کا مذہبی اور ملی تشخص مزید نمایاں ہو کر ابھر آتا ہے کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، پڑھنے لکھنے الغرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام افعال واحوال اور پوری انسانی بود و باش پر ایک ہی رنگ چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے اور وہ رنگ توحید ہے۔ اس حوالے سے مسلمانوں کے ملی تشخص کا ذکر قرآن میں یوں ملتا ہے۔

وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝

(البقرہ، ۲:۱۳۹)

اس اعلان وفاداری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنا کوئی کام

بھی اس ذات کے نام کے بغیر شروع نہ کرے۔ گویا تسمیہ کی دوسری عملی حکمت وافادیت یہ ہے کہ یہ ایک مسلمان کے لئے ذات حق سے وفاداری اور اس کی غلامی کا ایسا قلادہ ہے، جس کے ذریعے وہ قدم قدم پر پہچانا جاتا ہے۔ یہ قلادہ غلامی اس کے بندوں میں باغی اور اطاعت گزار کی تمیز کر دیتا ہے۔ اہل دل تو محبوب سے بصد اصرار اس کے قلادہ غلامی کی طلب کرتے ہیں بقول حافظؒ

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ بر بندی
چرا بگردن حافظ ' نمی کند رسنی

لیکن اس محبوب حقیقی نے اپنے بندوں کی پہچان کے لئے تسمیہ کی صورت میں خود ہی قلادہ وفاداری مہیا کر دیا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اس کا نام کیوں نہ لیا جائے۔ جب اسلام کی تعلیم ہی یہ ہے کہ مرد مومن کا جینا اور مرنا سب کچھ اسی کے لئے ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدَانِیۡ رَبِّیۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرَاهِیۡمَ حَنِیۡفًا وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَo

قُلۡ اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَo

(الانعام ۶: ۱۶۱۔۱۶۲)

فرما دیجئے بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی ہدایت فرما دی ہے (یہ) مضبوط دین (کی راہ ہے اور یہی) اللہ کی طرف یکسو اور ہر باطل سے جدا ابراہیم کی ملت ہے اور وہ مشرکوں سے نہ تھے۔ فرما دیجئے کہ بے شک میری نماز اور میرا حج و قربانی (سمیت سب بندگی) اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

متذکرہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت مرد مومن کے شعار حیات کے عنوانات بیان کر رہی ہے کہ وہ صراط مستقیم ہے، دین قیم ہے، ملت ابراہیمی ہے۔ اس کا خاصہ ''حنیفیت'' ہے جس کا معنی ''ہر باطل سے جدا اور ممتاز رہنا'' ہے۔ شعار ایمان یہ ہے کہ وہ ہر غلط کام سے الگ رہنا چاہتا ہے، دین صحیح کسی سطح پر بھی شیطانی خیالات وتصورات اور باطل ومشرکانہ شعار واطوار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا، اس کی سرشت میں ہی امتیاز وانفرادیت کی خاصیت رکھ دی گئی ہے، اور پھر دوسری آیت میں مرد مومن کے اس منفرد شعار حیات کا مضمون مندرج ہے۔ جس کا عنوان پہلے مذکور ہو چکا ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ اس کی تمام عبادتیں اور ایثار وقربانی کے اعمال اور اس کا جینا اور مرنا الغرض پوری زندگی آغاز سے انجام تک اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہوتی ہے۔ ''لا شریک له'' وہ رب العالمین کے سوا کسی اور کو اپنا منتہائے مقصود تصور نہیں کر سکتا'' ''و بذالک امرت'' اور مرد مومن کو اسی کمال درجے کی وفاداری، غلامی اور اخلاص کا حکم دیا گیا ہے'' ''و انا اول المسلمین'' اور سب سے پہلے اس کی بارگہ عظمت میں سر تسلیم خم کرنا اس کا شعار اسلام اور دلیل

ایمان ہے۔ گویا اسلام زندگی کے ہر معاملے میں مسلمانوں کو ایک مخصوص اور منفرد رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان اپنی معاشرت و معیشت اور تہذیب و ثقافت میں ایک الگ قوم نظر آئیں۔ ان کا شعار زندگی دیگر تہذیبوں اور معاشروں سے مابہ الاشتراک خصائص پر نہیں بلکہ مابہ الامتیاز خصائص پر مبنی ہو اور معاشرت میں اس امتیاز کی بنیاد یہی ہے کہ ان کا ہر کام خالصتاً اللہ کے نام سے شروع ہو اور اسی کی رضا پر منتج ہو۔ یعنی ہر معاملے میں ذات باری تعالیٰ کے ذکر کو ہی ابتداء و انتہا کا درجہ حاصل ہو جیسا کہ اس شعر میں مذکور ہے۔

مری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

یہی تسمیہ کی بنیادی تعلیم ہے۔

(۳) ترک تکبر کی تعلیم

تسمیہ کی تیسری عملی حکمت و افادیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو جملہ امور حیات میں غرور اور فخر و مباہات کا انداز ترک کر دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس نکتے کا علمی پہلو شروع میں حذف فعل کی تیسری حکمت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ انسان جب بھی کوئی کام کرنے لگے خواہ اس میں اس کی کتنی محنت و مشقت ملوث ہو۔ کتنی صلاحیتیں اور استعدادیں زیر کار ہوں اور اس سے بے شک اس کے کتنے ہی شخصی اوصاف و کمالات اجاگر ہو رہے ہوں۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے تاکہ اس کے ذہن میں یہ تصور راسخ رہے کہ یہ سب کچھ رب کائنات کی مدد سے انجام پا رہا ہے۔ اس کی اعانت و نصرت کے بغیر میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا سرچشمہ وہی ذات ہے۔ تسمیہ انسان کے عمل کو کبر و نخوت سے پاک کر کے تواضع اور انکساری کے زیور سے آراستہ کرتا ہے اور انسان کو ہمیشہ اپنی بے بسی اور بے کسی کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے' تاکہ اس کے دل و دماغ میں رعونت کا بت تعمیر نہ ہونے پائے۔ انسان اپنے اعمال و افعال اور کامیابیوں اور کامرانیوں میں بجائے اپنی صلاحیتوں پر فخر کرنے کے ہمہ وقت اس کے سامنے جھکتا اور اس کا شکر بجا لاتا رہے' جس طرح تمام خیرات و حسنات کے مبدا کامل اور پیکر اتم ﷺ سے ان کی کثرت ریاضت و عبادت اور بے پناہ گریہ وزاری کا سبب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ تو تمام خطاؤں اور گناہوں سے پاک اور معصوم ہیں اور نیکی و تقوی خود آپ ﷺ کے اعمال و افعال سے وجود پاتے ہیں تو آپ ﷺ کو آخر اس قدر محنت و مشقت کی کیا ضرورت ہے؟

حضور ﷺ نے جواب دیا۔

اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًاo — کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

(صحیح البخاری' کتاب التھجد' ۱:۱۵۲)

(۴) ادب بندگی کی تعلیم

ترک تکبر کے بعد تسمیہ انسان کو کامل بندگی کے آداب بھی سکھاتا ہے اور آداب بندگی میں سب سے بنیادی ادب ''مقامِ شکر'' ہے، جب کوئی فاعل اخلاق اپنے ہر فعل کا آغاز ہی نامِ حق سے کرتا ہے تو وہ ایک اعتبار سے اپنی ذات سے صادر ہونے والے فعل پر پہلے ہی باری تعالیٰ کا شکر ادا کر دیتا ہے۔ کیونکہ شکر کسی کی نعمت و احسان پر اس کی تعریف ہے۔ جستجو میں پیش آنے والی مشکلات کا حتمی حل میسر کرنا ہوگا اور ذہن انسانی میں ابھرنے والے ان تمام طبعی اور مابعد الطبیعی سوالات کت وکمال کی بنا پر اپنا فعل صادر کرنے سے پہلے اپنے منعم و معطی کا شکر بجالاتے ہوئے اس کی توصیف کرنے لگتا ہے کہ ''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم کرنے والا ہے'' یہ کمال بندگی ہے کہ وہ صدور فعل سے بھی پہلے محض اس کی توفیق و انعام کے شعور کی بنا پر اپنے آقا و مولیٰ کی تعریف کرنے لگے۔ صدور فعل سے پہلے باری تعالیٰ کا نام لینا اس امر کو متیقن کرنے کے مترادف ہے کہ جو کچھ میری ذات سے صادر ہونے والا ہے وہ میرا نہیں بلکہ میرے رب کا کمال ہے۔ لہٰذا اپنی فنائیت کیساتھ اپنے کمالات کو باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ''کامل بندگی'' کی علامت ہے۔ ہمیشہ سے مقبولان خدا کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے کمالات و کرامات کو باری تعالیٰ کی طرف ہی منسوب کرتے رہے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک یہ طریقہ قرب کے بلند مقامات میں سے ہے جسے ''قرب فرائض'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تسمیہ اور قرب فرائض

اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو تسمیہ کی ساری تعلیم درحقیقت بندگی میں قرب فرائض کے آداب سکھاتی ہے، جہاں بندہ اپنے ہر کمال کو رب ذوالجلال کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرب نوافل مقابلتاً ادنیٰ درجہ ہے۔

اس مقام پر بندہ اپنے افعال و کمالات کو اپنی ہی طرف منسوب کرتا ہے، حالانکہ فی الحقیقت قدرت فعل اور توفیق کمال تو ہر ایک کو بارگاہ الوہیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں مقام ولایت بلند ہوتا چلا جاتا ہے، ادراک حقیقت کی استعداد بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور بالاخر ایک مقام وہ آتا ہے جہاں عارف ہر فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے لگتا ہے۔ قرب نوافل کی بناء پر نسبت کمال کو اپنی طرف کرنے اور قرب فرائض کی بنا پر نسبت کمال کو باری تعالیٰ کی طرف کرنے کے درمیان فرق کو مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حوالے سے اس طرح واضح کیا ہے۔

''فرمایا کہ قم باذنی قرب نوافل ہے مرتبہ الوہیت میں کہ عروج میں پیش آتا ہے۔ جیسا کہ شمس تبریز پر گزرا اور ''قم باذن اللہ'' قرب فرائض اور یہ نزول بعد العروج پیش آتا ہے۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس مرتبہ میں تھے اور یہ مرتبہ اعلیٰ ہے اول سے، شرک و کفر کہنا اس کو بھی جہل ہے۔'' (حاشیہ از مولانا تھانوی)

''قولہ قم باذنی قرب نوافل ہے۔ اقول جس کی تعبیر اصطلاحی اس عنوان سے کرتے ہیں کہ عبد فاعل ہو اور حق تعالیٰ آلہ اور قرب فرائض کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ فاعل ہو اور عبد آلہ اور یہ اول سے اعلیٰ ہے سو قم باذنی میں احیاء کی اسناد عبد کی طرف ہے اور باذن اللہ میں حق کی طرف۔'' (امداد المشتاق: ۷۱)

تسمیہ اور مقام تکوین

یہ حقیقت ہے کہ باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے کئی ایک کو ''مقام تکوین'' سے نوازتے ہیں جس کی تصریح سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

قال اللہ تعالی فی بعض کتبہ یا ابن ادم انا اللہ الذی لا الہ الا انا اقول للشئی کن فیکون اطعنی اجعلک تقول للشئی کن فیکون وقد فعل بکثیر من انبیائہ و اولیائہ و خواصہ من بنی ادم

(فتوح الغیب، مقالہ ۱۶)

(بھجۃ الاسرار و معدن الانوار: ۳۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتابوں میں فرمایا ہے۔ اے ابن آدم میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں جب کسی چیز کو کن کہتا ہوں تو وہ ہو جاتی ہے، تو میری اطاعت کر، میں تجھے بھی یہ مقام عطا کردوں گا کہ جب تو کسی چیز کو کن کہے گا تو وہ ہو جائے گی اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و اولیاء اور خواص بنی آدم میں سے کافی لوگوں کو یہ مقام عطا کیا ہے۔

آپؒ نے کئی اور مقامات پر بھی مقام بندگی کی یہ شان و منزلت بیان کی ہے۔ جس سے بعض خواص کا صاحب تکوین ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ امام تاج الدین سبکیؒ امام عبدالرحمٰن جامیؒ ملا علی قاریؒ امام جلال الدین سیوطیؒ شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، امام عبدالوہاب شعرانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ امام یوسف بن اسماعیل نبہانیؒ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ وغیرہم نے بھی اہل اللہ میں سے بعض افراد کا مقام تکوین پر فائز ہونا بیان کیا ہے۔ اس موضوع کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کے لئے امام نبہانی کی کتاب ''جامع کرامات الالیاء'' یا مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''جمال الاولیاء'' کا مطالعہ فرمائیں۔ انہوں نے اسی امر کی تائید میں متعدد دلائل وشہادات فراہم کی ہیں یہ بات توضمناً آ گئی تھی۔ جونکتہ یہاں بیان کرنا مقصود تھا وہ یہ ہے کہ باوجود مقام تکوین کے حامل ہونے کے مقبولان الٰہی اپنے ہر کمال بلکہ فعل تکوین کو بھی ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں کیونکہ ادب بندگی کا تقاضا یہی ہے۔ عظیم محدث

وفقیہہ امام عبدالوہاب شعرانیؒ اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں۔

فان قیل فاذا اعطی الحق تعالی بعض خواصه فی هذه الدار حرف کن هل یتصرف بها ام الادب ترکه (فالجواب) کما قال الشیخ فی الباب السابع والسبعین و مائة ان من ادب اهل الله تعالی اذا اعطاهم الله تعالی التصرف بلفظة کن فی هذه الدار لایتصرفون بها لان محلها الدار الاخرة و لکنهم جعلوا مکان لفظة کن بسم الله لیکون التکوین لله تعالی ظاهرا کما هوله تعالی باطنا

(اگر یہ کہا جائے) کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے بعض خواص کو حرف کن عطا کرتے ہیں تو کیا وہ اس سے تصرف بھی کرتے ہیں یا ادباً ترک کر دیتے ہیں؟ (پس اس کا جواب یہ ہے) جیسا کہ شیخ نے باب ۱۷۷ میں بیان فرمایا ہے کہ بے شک اہل اللہ کا ادب یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں لفظ کن کا تصرف عطا فرما دیں تو وہ اس تصرف کو استعمال میں نہیں لاتے کیونکہ اس کا مقام دار آخرت ہے۔ لیکن وہ تصرفات میں بجائے لفظ کن کہنے کے بسم اللہ کہہ لیتے ہیں تا کہ تکوین کی نسبت ظاہرا بھی اللہ کی طرف ہو جائے جیسے کہ باطناً ہے۔

(الیواقیت والجواہر، ۱: ۱۴۷)

یہی وہ مقام تکوین ہے جہاں مرد مومن کی نگاہ سے تقدیریں بدلتی ہیں' کیونکہ خود رضائے الٰہی ہر لمحہ بندے کی خواہش و آرزو کی منتظر ہوتی ہے اور قدرت الٰہی اس کی تکمیل کی جس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

(آل عمران' ۳: ۳۱)

کیا اللہ کا محبوب ہو جانا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ تقدیر الٰہی خود بندے کی آرزو کی تکمیل بن جائے؟ اقبالؒ اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ وہ مقام بندگی ہے جہاں بندے کی ہر آرزو اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کا پورا کرنا خود غیرت الٰہیہ اور باری تعالیٰ کی شان محبیت کا تقاضا بن جاتا ہے کیونکہ بندہ محبوب بن جائے تو پھر وہ منتظر ہی نہیں منتظر بھی ہو جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللّٰہ لابرہ

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والادب، باب فضل الضعفاء والخاملین، ۲:۳۲۹)

کتنے منتشر بالوں والے بندگان خدا ایسے ہیں جنہیں دروازوں سے دھتکار دیا جاتا ہے لیکن ان کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کی قسم کھا لیں تو غیرت خداوندی ان کی قسم بہرصورت پوری کر کے رہتی ہے۔

آخر ایسا کیوں نہ ہو۔ ہر محبّ اپنے دوست اور محبوب کی ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا مقصد زیست سمجھتا ہے۔ لیکن تسمیہ ایسا ادب بندگی ہے کہ اس مقام پر جہاں بندہ خود مطلوب و مقصود بن جاتا ہے، پہنچ کر بھی نظرانداز نہیں ہو سکتا اور یہ کس طرح نظرانداز ہوتا کہ جملہ مقامات بندگی بھی تو اسی ادب و قرینہ کے باعث نصیب ہوتے ہیں۔

(۵) توحید و توکل کی تعلیم

تسمیہ کی عملی حلمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب انسان اپنے ہر کام کے آغاز میں اپنے خالق و مالک کا نام لے تو اس سے اسے تین فوائد حاصل ہوں۔

☆ ایک اس کے دل و دماغ میں باری تعالیٰ کی معیت اور رفاقت و مصاحبت کا احساس پیدا ہو۔

☆ دوسرے اس کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے شامل حال ہونے کا اعتماد پیدا ہو۔

☆ تیسرے اس کے نام کی برکت سے مطلوبہ امر میں کامیابی و کامرانی کا پختہ یقین ہو جائے۔

ان تینوں فوائد کی علمی حکمتوں پر شروع میں ''حرف باء کی افادیت'' کے عنوان کے تحت روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ جب انسان خدا کی مدد و نصرت اور اس کی رفاقت و مصاحبت کے احساس سے سرشار ہو کر کوئی جدوجہد کر رہا ہوگا تو اسے کسی باطل قوت کا خوف پریشان نہ کر سکے گا۔ وہ ہر مخالفت و مزاحمت سے بے نیاز اور ہر دشمنی و عداوت سے بے خوف ہو کر اپنی کاوشیں جاری رکھے گا۔ اس طرح اسے اپنے کام میں دلجمعی، یکسوئی اور کامیابی کا پختہ یقین نصیب ہوگا۔ کام کے شروع میں اللہ کا نام لینا محض رسماً نہیں بلکہ اس تصور کے ساتھ ہونا چاہئے کہ میں اس کا غلام ہو کر جب اسی کے حکم کی تعمیل اور ہر مشکل سے نکالنا بھی اسی کا کام ہے اور وہ یقیناً سب سے بہتر کارساز ہے مجھے کیا پڑی کہ میں پریشان ہوتا پھروں۔ جو میرا فرض تھا میں نے پورا کر دیا باقی معاملہ اور اس کا انجام اللہ کے سپرد ہے۔ اگر انسان تسمیہ کی اس حقیقی روح کو پا لے تو اس کی زندگی میں نہ کوئی اذیت باقی رہے نہ خوف و غم۔ اصل توحید یہی ہے جو انسان کو زندہ توکل کا سبق دیتی ہے دنیا کے خوف

وخطر اور یاس وغم سے محفوظ اور بے نیاز کرتی ہے۔ اسی سے انسان کی شخصیت کے اندر ایک زبردست انقلاب بپا ہوتا ہے جس کی قوت سے وہ ہر مد مقابل کو تہ وبالا کر دیتا ہے۔ اسی نکتے کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے روح توحید کو فراموش کر کے اس کی کلامی حیثیت کے حوالے سے خود کو تفرقہ وانتشار کے سپرد کر دیا۔ جس کے باعث ہم بجائے معزز اور قوی و مستحکم ہونے کے ذلیل و رسوا اور کمزور و ناتواں ہو گئے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
اب مگر کیا ہے؟ فقط مسئلہ علم کلام

چنانچہ تسمیہ انسان کے لئے اسی حقیقی توحید اور کامل توکل کی تعلیم ہے کہ جب خدا کی مصاحبت واعانت اس کے ساتھ ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے نیک عزائم میں کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔

اسی تصور کو قرآن یوں بھی بیان کرتا ہے۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ○
(محمد ﷺ ۴۷: ۳۵)

پس تم حوصلہ نہ ہارو اور نہ باطل سے صلح کرو، بے شک غالب تم ہی آؤ گے کیونکہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہاری کوششیں بے نتیجہ نہیں جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک پختہ عزم کے ساتھ ایسا کامل اور ناقابل شکست یقین نہ ہو جدوجہد پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

امیری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرات رندانہ

(۶) اصلاح احوال کی تعلیم

تسمیہ کی عملی حکمتوں میں سے یہ بھی انتہائی اہم حکمت ہے کہ اس سے پوری زندگی کے احوال کی اصلاح ہوسکتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے فرمایا ''بسم اللہ'' صرف جائز کاموں پر پڑھی جائے ناجائز کاموں پر نہیں۔ ایک طرف آپ ﷺ نے بسم اللہ کے فضائل وبرکات اور اسرار وحکم اتنی اہمیت کے ساتھ بیان فرمائے کہ ہر کلمہ گو کو اس کے پڑھنے کی ترغیب وتحریص ہو اور ہر شخص اس کے ذکر کے انوار سے اپنا قلب و باطن منور کرنے کا خواہشمند ہو۔ لیکن

ساتھ ہی یہ پابندی لگا دی کہ بسم اللہ کسی بھی ناجائز اور شرعاً ممنوع کام کے سلسلے میں نہیں پڑھی جا سکتی۔ یہ اسلام کے نظام اصلاح کی ایک عجیب حکمت تھی۔ جس طرح ایک بچے کو نیا سوٹ، کھلونا یا اس کی پسند کی کوئی خوبصورت چیز لے دینے کا وعدہ کیا جائے اور بچے کے دل میں اس کا شوق اس قدر بڑھایا جائے کہ وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی آرزو کرنے لگے، تب اس پر یہ شرط عائد کر دی جائے کہ اگر فلاں برا کام کرو گے تو تمہیں وہ چیز نہیں ملے گی۔ اب بچہ دو امور میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا، اگر اس چیز کی طلب صادق اس کے دل میں بدرجہ کمال موجود ہوگی تو وہ اس کی خاطر ہر بری عادت ترک کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اسلام نے بعض امور کی اصلاح اس حکمت کے ساتھ بھی کی ہے۔ قرآن حکیم میں ابھی شراب کی حرمت کا واضح حکم نہیں آیا تھا اس وقت لوگ شراب کے اتنے رسیا تھے کہ انہیں اس سے باز رکھنا ایک مسئلہ تھا۔ اسلام نے صحابہ کرامؓ کو نماز اور یاد الٰہی کی ترغیب دی۔ صحابہ کرامؓ کو نماز اور وہ بھی جناب محمد مصطفی ﷺ کی اقتدا میں اتنی عزیز ہوگئی کہ اسے ترک کرنا ان کے بس میں نہ رہا۔ باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت، یاد الٰہی میں خاص لطف اور کیف و سرور کی کیفیت، دن میں کم از کم پانچ مرتبہ اوقات نماز پر رسول اکرم ﷺ کے دیدار فرحت آثار کی لذت اور پھر صحبت نبوی ﷺ کے وہ مقدس لمحات جن کے لئے قدسیان فلک بھی ترستے تھے۔ یہ وہ ترغیبات تھیں جو صحابہ کو نماز سے کسی حالت میں محروم نہیں ہونے دیتی تھیں۔ جب صحابہ میں طلب صلوٰۃ اس قدر شدید ہوگئی تو اس وقت یہ حکم صادر کیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔

اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم وہ بات سمجھنے لگو جو کہتے ہو۔

(النساء، ۴: ۴۳)

صحابہ کو حالت نشہ میں صرف نماز بلکہ مسجد میں جانے سے بھی روک دیا گیا۔ اب ان کے لئے دونشوں میں سے ایک نشہ منتخب کرنا تھا شراب کی لذت و نشہ کو یا یاد الٰہی کی لذت و نشہ کو۔ انہوں نے بالآخر شراب کا پینا ترک کر دیا تاکہ نماز کے اوقات حالت نشہ سے محفوظ رہیں۔ بس اسی طرح ایک تسمیہ کے ذریعے خدا کی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں کا مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ تمہاری زندگی کے احوال خدا کے نام کی فضیلت و برکت سے سنور جائیں گے۔ دوسری طرف انہیں برے کاموں پر خدا کا نام لینے سے روک دیا گیا۔ اب مرد مسلمان کے لئے دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے ''خدا کے نام کا'' یا ''ناجائز و ممنوع کام کا''۔ پس خدا کے نام کی چاہت رکھنے والے ناجائز کام کے قریب کیوں پھٹکیں گے۔ لہٰذا تسمیہ کی برکت و فضیلت کا احساس دل میں جاگزیں ہو جائے تو انسانی زندگی کے جملہ احوال از خود اصلاح پزیر ہو جاتے ہیں کہ جب ناجائز اور غیر شرعی امور میں خدا کا نام لینا بھی ممنوع ہو تو کم از کم خدا کا نام ترک کرنے کی حیا ہی انسان کو غلط کاری

سے باز رکھے گی۔

(۷) مظاہر قدرت کے عرفان کی تعلیم

تسمیہ انسان کو معرفت حق کے لئے قدرت الٰہیہ کے مظاہر کے عرفان کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس دنیا میں خدا کی معرفت اس کی ذات وصفات کے مظاہر کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ کلمات تسمیہ اسم الٰہی سے شروع ہوتے ہیں اور پھر اسم کی اضافت' لفظ اللہ اور رحمٰن' الرحیم تینوں کی طرف ہے' جیسا کہ پہلے بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور الرحمٰن الرحیم اسماء صفات اسم چونکہ ذات وصفات کا مظہر ہوتا ہے یعنی نام کے بغیر نہ کوئی ذات پہچانی جاسکتی ہے اور نہ اس کی صفات۔ اس لئے باری تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات دونوں کے بیان سے پہلے ''اسم'' کا ذکر کر دیا یہاں یہ بات بھی واضح طور پر ذہن نشین رہے کہ اسم نہ ذات کا عین ہوتا ہے نہ صفات کا۔ جب اسم ذات وصفات دونوں کا غیر ہوکر ان کا مظہر ہونے کی وجہ سے ان کی معرفت کا ذریعہ اور واسطہ ہے اور اسی کو حرز جاں بنانے کی تلقین کی جارہی ہے تو اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ ذات حق کی معرفت صرف اس کے مظہر کامل کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ اسی طرح کائنات میں بھی کتنے پیکر حسن اور نظارہ ہائے جمال ہیں جن میں جمال ایزدی کی جھلک نمایاں ہے۔ کتنے مرقع کمال اور مناظر عظمت وجلال ہیں جو سطوت ربوبیت کا جلوہ دکھارہے ہیں' کتنے مظاہر محبت ورحمت ہیں جو اس کی شان رحیمیت کو عیاں کررہے ہیں۔ الغرض ہر سو اسی کی ذات وصفات کی مختلف شانیں جلوہ ریز ہیں جو اس کی معرفت کا ذریعہ بنتی ہیں' اسی وجہ سے انسان کو کائنات کی تخلیق اور اس کی آیات وعلامات میں غور وفکر کی تلقین کی گئی تا کہ وہ مظاہر قدرت کی معرفت سے ان میں جلوہ گر حقیقت ابدی کی معرفت تک رسائی حاصل کرسکے۔

قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَO

(العنکبوت' ۲۹: ۴۴)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصد کے ساتھ پیدا کیا (اور وہ مقصد یہ ہے کہ) بے شک ان میں اہل ایمان کے لئے معرفت حق کی بہت بڑی نشانی ہے۔

دوسرے مقام پر غافل انسانوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَO

(الدخان' ۴۴: ۳۹)

ہم نے آسمان اور زمین کو صرف خاص مقصد کے لئے پیدا کیا (تا کہ لوگ ان کے ذریعے ہماری معرفت حاصل کریں) لیکن اکثر انسان اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

قرآن کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں مظاہر قدرت میں غور وفکر کی نصیحت نہ کی گئی ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر ان مظاہر کی معرفت مطلوب نہ تھی تو ان میں غور وفکر اور تدبر وتعقل کی تعلیم کیوں دی گئی؟ اور اگر ان میں غور وفکر کی تلقین ان کی معرفت کی غرض سے ہے تو کیا ان مظاہر ومناظر کی معرفت مقصود بالذات ہے یا ان کی معرفت کے ذریعے کسی اور حقیقت کی تلاش ہو رہی ہے؟ اگر ان مظاہر قدرت کی معرفت کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ یہ تو خود بھی موجود بالذات نہیں ہیں جب یہ اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال کو پہنچنے میں کسی اعلیٰ ہستی کے محتاج ہیں۔ کائنات میں ان کی کارفرمائیاں اور جلوہ ریزیاں خود اس ابدی حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہیں جس کے باعث انہیں وجود وظہور نصیب ہوا ہے تو ان کی معرفت اس ہستی مطلق کی معرفت کا ذریعہ کیوں نہ بنے گی۔ لہٰذا قرآن کا بار بار مظاہر کائنات کی معرفت کے لئے انسان کو متوجہ کرنا اسی غرض سے ہے کہ ان کے ذریعے انسان کو خدا کی ہستی وصفات کی معرفت حاصل ہو۔ پھر کائنات میں صرف بے جان مظاہر ہی موجود نہیں بلکہ ذی روح اور ذی شعور موجودات بھی جلوہ گر ہیں جو معرفت الٰہیہ کی سب سے زیادہ موثر صورت ہیں۔ ان میں انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے لہٰذا وہ معرفت الٰہیہ کا کامل ترین ذریعہ ہوگا۔ اس لئے قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

لِّلْمُوْقِنِيْنَo وَ فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَo
(الذاریات، ۵۱: ۲۰، ۲۱)

اور اصحاب یقین کے لئے زمین میں ایک معرفت الٰہی کی نشانیاں موجود ہیں (اور تم باہر کیوں دیکھتے ہو) خود تمہارے اندر بھی معرفت حق کی دلیلیں ہیں پھر تم کیوں نہیں دیکھتے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔
(المومن، ۴۰: ۶۴)

(لوگو) اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قیام کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا اچھی صورتیں بنائیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔
(حم سجدہ، ۴۱: ۵۳)

ہم عنقریب انہیں اپنی معرفت کی نشانیاں کائنات میں اور نفوس انسانی کے اندر دکھا دیں گے۔

انسان کو اس قدر باکمال اس لئے بنایا گیا کہ وہ ذات وصفات باری تعالیٰ کی معرفت

کے لئے سب سے اعلیٰ ذریعہ قرار پا سکے۔ چنانچہ تسمیہ میں اسم ''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ وارد کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اس اسلوب بیان کے ذریعے انسانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ باری تعالیٰ کی ذاتی اور صفاتی معرفت کے حصول کے لئے اس کے مظاہر کی معرفت حاصل کی جائے۔

(۸) ذرائع و اسباب سے استفادہ و استمداد کی تعلیم

تسمیہ کا حرف با ''مصاحبت' استعانت یا تبرک'' کے معنی کے لئے وارد ہوا ہے جیسا کہ ہم شروع میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ آیت میں یوں نہیں فرمایا گیا باللہ الرحمٰن الرحیم (اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن و رحیم ہے) بلکہ تسمیہ کے الفاظ یہ ہیں: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اللہ کے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے یا اللہ کے نام کی مصاحبت و رفاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے یا اللہ کے نام سے فیض و برکت طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں جو رحمان و رحیم ہے)۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں مفسرین اور علماء محققین میں سے کسی کو بھی تامل نہیں کہ انسان کو تسمیہ کے ذریعے خدا کے نام سے استفادہ و استمداد کی تلقین کی گئی ہے اور نام بالا تفاق منزل ذات تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس آیت میں جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر آداب معاشرت کی تعلیم کی غرض سے نازل ہوئی' ذریعے اور سبب سے استعانت و مصاحبت اور تبرک کی راہ دکھائی گئی ہے؟ دراصل آیت تسمیہ کا یہ انداز و اسلوب انسان کی عملی زندگی کی ہدایت کے لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اسے یہ علم ہو جائے کہ جس طرح ذات و صفات باری تعالیٰ تک رسائی اور ان سے استعانت و مصاحبت اس کے اسماء کے ذریعے سے ممکن ہے' اسی طرح اس دنیا کی زندگی بھی جو لاکھوں مقاصد و مطالب کے حصول پر منحصر ہے۔ تب ہی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اگر ان مقاصد کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ذرائع و اسباب سے کما حقہ استفادہ کیا جائے۔ اس عالم شہادت کا سارا نظام اسباب و علل کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ یہاں انسان کو ذرائع و اسباب سے لاتعلق ہو کر کچھ بھی میسر نہیں آ سکتا۔ اگر احوال حیات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ دنیا میں انسان کی پیدائش رشتہ ازدواج کے ذریعے پر منحصر ہے۔ تولد کے بعد اس کا پرورش پانا والدین کی شفقت کے سبب سے ہے اس کا تعلیم یافتہ ہونا اس کے اساتذہ کی تربیت پر مبنی ہے۔ اس کا مہذب ہونا اس کے ماحول اور معاشرت کے احوال پر منحصر ہے۔ اس کا کھانا پینا' لباس پہننا' صحت و تندرستی' جملہ امور معاش و معاد یہاں تک کہ اس کی موت پر تجہیز و تکفین اور دیگر معاملات کا انجام پانا اول سے آخر تک سب کچھ اسباب و ذرائع سے تکمیل پزیر ہوتا ہے۔ بتایئے کہ حیات انسانی کا کونسا مرحلہ ایسا ہے جہاں اسے اسباب و ذرائع کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا گیا ہو' یقیناً کوئی نہیں۔

غیر مادی اور روحانی اسباب کی واقعیت

اسباب مادی بھی ہوتے ہیں غیر مادی بھی۔ عام حالات میں کوئی معاملہ اگر کسی مخصوص مادی سبب سے انجام پاتا ہو تو کسی وقت میں اس کا کسی غیر مادی یا روحانی سبب سے انجام پانا نہ تو ناممکن ہوتا ہے اور نہ اس سے وہ امر مافوق الاسباب قرار پا جاتا ہے۔ دربار سلیمانی میں آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کا لایا جانا' صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا پتھر میں سے ظاہر ہونا' عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا' بنی اسرائیل کے لئے دریا میں خشکی کے راستوں کا پیدا ہونا' ان کے لئے آسمان سے مائدہ اور من وسلویٰ کا اترنا' اصحاب کہف کا تین سو نو سال تک زندہ رہنا اور اس عرصہ میں سورج کا راستہ بدل کر طلوع وغروب ہونا' عیسیٰؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا' کوڑھی اور مادر زاد اندھوں کا شفا پانا' یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا' مریم علیہا السلام کو بغیر موسم کے پھلوں کا میسر ہونا' موسیٰ علیہ السلام کے ناشتے کے لئے بھنی ہوئی مچھلی کا دوبارہ زندہ ہو جانا' ابراہیم علیہ السلام کے پکارنے پر کٹے ہوئے پرندوں کے ٹکڑوں کا زندہ ہو کر اڑ جانا' عزیر علیہ السلام کے گدھے کا سو سال کے بعد زندہ ہو جانا' ان کے کھانے کا سو سال تک باسی نہ ہونا' یوسف علیہ السلام کی قمیص کے ذریعے یعقوب علیہ السلام کی بینائی کا لوٹ آنا یہ ایسے قرآنی واقعات ہیں جو عادی اسباب اور مادی معمولات سے ہٹ کر روحانی اسباب وعلل کے حوالے سے انجام پذیر ہوتے رہے' جنہیں شریعت میں معجزات وکرامات کا نام دیا جاتا ہے۔ ''معجزہ ہو یا کرامت' ارہاص ہو یا استدراج'' یہ سب اصطلاحات تو شرعی ضرورت کے تحت وضع کی گئی ہیں۔ لیکن ان سب امور میں جو بنیادی نکتہ مشترک طور پر کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب امور مادی اسباب وعلل اور عادت ومعمول کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے عقل عادی ان کے وقوع کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے ان کے صدور وظہور کو آپ قدرت الٰہیہ کا نام دیں' تصرفات نبوت کا نام دیں' تصرفات ولایت کا یا مطلق تصرفات روح کا' بہرصورت جو کچھ کہیں وہ صدور غیر مادی اور روحانی اسباب ہی کے حوالے سے تصور ہوگا۔ صوفیاء نے ایسے خوارق اور حسی کرامات کے روحانی اسباب وعلل اور ان کی مختلف صورتوں پر بڑے عارفانہ انداز میں شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے جو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ عالم شہادت کا ہر واقعہ ذرائع اور اسباب ہی کے حوالے سے رونما ہوتا ہے اور جن خوارق کو لوگ بلا سبب ظہور پذیر ہونے والے واقعات سمجھتے ہیں وہ بھی درحقیقت اسباب وذرائع سے ہی معرض وجود میں آتے ہیں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے اسباب غیر مادی' غیر مرئی' غیر حسی اور روحانی ہوتے ہیں عقل جس کا تمام تر انحصار ظاہری حواس پر ہے ان کے ادراک اور شعور کامل سے محروم رہتی ہے لہٰذا ان حقائق کا صحیح فہم عقل نظری سے نہیں دل بینا سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ کہتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں

اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور ‘دل کا نور نہیں

یہاں غیر مادی اور روحانی اسباب کا ذکر اس وجہ سے ضروری تھا کہ باری تعالیٰ کی مدد اوراعانت انسان کو زندگی میں ہزاروں مادی ذرائع کے حوالے سے میسر آتی رہتی ہے اور انسان کو اس کا شعور بھی ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کی مدد و نصرت اور توفیق و اعانت بغیر مادی ذرائع کے محض روحانی ذریعے سے نصیب ہو جاتی ہے جس کا انسان کو علم تک نہیں ہوسکتا۔ تسمیہ نے یہی نکتہ واضح کر دیا کہ ''خدا کے نام کا'' واسطہ ایک روحانی اور غیر مادی واسطہ اور ذریعہ ہے' لہٰذا اس سے استعانت و استمداد کی تلقین عون الٰہی کے روحانی مظاہر کے ذرائع کی اہمیت کو واضح کر رہی ہے چنانچہ سائنس' میڈیکل' ٹیکنالوجی اور جدید علوم و فنون کی ترقی عون الٰہی کے مادی ذرائع کا درجہ رکھتے ہیں اور مخلوقات میں سے عون الٰہی کے روحانی مظاہر غیر مادی ذرائع کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کی مشکلات کو دور کرنے اور اسے اصل نصب العین تک پہنچانے کے لئے مادی و غیر مادی دونوں قسم کے ذرائع سے استفادہ اور استمداد عین حق و صواب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اہل ایمان کو باری تعالیٰ کی مدد و نصرت روحانی ذرائع اور

www.MinhajBooks.com

اسباب کی صورت میں میسر آتی رہی ہے۔ عہد رسالت ﷺ اور عہد صحابہؓ کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ قرآنی بیان کے مطابق غزوہ بدر میں اہل ایمان کی مدد کے لئے خود آنحضرت ﷺ کی دعا پر فرشتوں کا نزول اس حقیقت کی قطعی شہادت ہے۔

(۹) اسماء الٰہیہ کے ذکر کی تلقین

انسانی زندگی میں صرف جسمانی ضرورتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ روح کی پرورش، تقویت اور پاکیزگی وطہارت بھی مطلوب ہوتی ہے کیونکہ انسان نہ صرف جسم مجرد کا نام ہے اور نہ صرف روح مجرد کا۔ انسانی شخصیت دونوں کے اجتماع سے تشکیل پاتی ہے اور ان کے تقاضوں کی صحیح تکمیل سے کمال کو پہنچتی ہے۔ جس طرح خوراک اور لباس وغیرہ جسم کی ضرورتیں ہیں اس طرح ذکر الٰہی اور تزکیہ وتصفیہ بہم پہنچانے والے اعمال صالحہ روح کی ضروریات ومرغوبات ہیں، جن سے اسے تقویت ملتی ہے، اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلام بیک وقت انسان کی ظاہری زندگی اور باطنی زندگی دونوں کی اصلاح چاہتا ہے۔ اصلاح کے دو درجے ہوتے ہیں درجہ ضرورت اور درجہ کمال۔ درجہ ضرورت سے مراد کسی شے کی ضروری حد تک اصلاح کرنا ہے تاکہ اس میں بگاڑ اور خرابی باقی نہ رہے۔ لیکن درجہ کمال سے مراد ضروری اصلاح کے بعد اس کو اس قدر سنوارنا ہے کہ وہ انتہائی کمال کو پہنچ جائے۔ پس شریعت اسلامیہ کا وہ حصہ جو اصطلاح فقہی اور امر ونواہی پر مشتمل ہے انسان کی ضروری اصلاح کے لئے تو کافی ثابت ہوتا ہے لیکن انسانی ظاہر وباطن کو صفاء وجلاء، پاکیزگی وطہارت اور روحانی تزکیہ کے لحاظ سے کمال تک پہنچانے کے لئے شریعت اسلامیہ کی ان تعلیمات کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں اصطلاح میں طریقت وتصوف کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ طریقت وتصوف اپنی غایت وماہیت کے اعتبار سے احکام شریعت کے مطابق روح کو تقویت دینے اور باطن کو پاکیزگی وطہارت کے زیور سے آراستہ کرنے کا ہی نام ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء انوار ذکر الٰہی سے روح کو منور کرنے کے لئے بکثرت ذکر وفکر کی تلقین کرتے ہیں اور یہ اذکار مختلف اسماء الٰہیہ پر

مشتمل ہوتے ہیں۔ جس بھی اسم مبارک کا کثرت کے ساتھ ذکر کیا جائے اس کی صفاتی تجلیات ذاکر کے قلب و باطن پر اپنا پرتو ڈالتی ہیں اور اس میں رفتہ رفتہ اس اسم کی صفات و برکات سرایت کرتی چلی جاتی ہیں۔ گویا ذکر سے نہ صرف روح کی تقویت وتنویر ہوتی ہے بلکہ اس کے خواص واثرات بھی انسان کے قلب و باطن پر مترتب ہوتے ہیں اور اس کی روحانی شخصیت خاص اثر کے تحت پرورش پاتی ہے۔ اس لئے راہ سلوک میں شیخ کامل کی ضرورت ناگزیر ہے کیونکہ وہ اپنی بصیرت سے دیکھتا ہے کہ سالک کو کس ذکر کی ضرورت ہے۔ اس کے قلب و باطن کو کیسے انوار اور روحانی اثرات سے زیادہ تقویت مل سکتی ہے اور اس کی روح کے لئے ذکر الٰہی کی صفاتی تجلیات میں سے کس قسم کی تجلی ناگزیر ہے۔ گویا شیخ اپنے مرید میں روحانی طور پر جس قسم کی کمی محسوس کرتا ہے اسی کو پورا کرنے کے لئے خاص قسم کے اذکار و اوراد کی تعلیم دیتا ہے اور جب ان سے ایک مقصد پورا ہو جائے تو مزید کمال کے لئے نئے اذکار تجویز کرتا ہے۔ بالکل اس کامل طبیب کی طرح جو مریض کی تشخیص کے بعد اس کی امراض اور اعراض وعلامات کے مطابق مخصوص ضابطہ علاج کے تحت اس کی اصلاح کرتا ہے۔ کبھی دوا بدلتا ہے اور کبھی خوراک، کبھی طویل عرصے کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے اور کبھی تھوڑے عرصے کے لئے۔ الغرض جسمانی امراض کی اصلاح کا یہ اصول اسی صاحب فن کو ہی معلوم ہوتا ہے کہ مریض کو اس وقت کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں۔ حالانکہ انسانی صحت وتندرستی کے لئے ادویات تو ہزاروں ہوتی ہیں اور ان کا فائدہ بھی اپنی اپنی جگہ مسلم ہوتا ہے، لیکن کس موقع پر کونسی دوا زیادہ مفید ہے اس کا فیصلہ طبیب کو کرنا ہے مریض کو نہیں۔ بعینہ شیخ کامل قرآن وسنت کے تجویز کردہ علاجات قولی وعملی، اوراد وظائف اور اسماء الٰہیہ کے متعدد اذکار میں سے کونسا اس شخص کی ضرورت کے مطابق زیادہ مفید ہے اس کا فیصلہ اپنی بصیرت ومہارت کی بنا پر کرتا ہے۔ اتنی بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اس علم وفن کا مبداء وسرچشمہ بھی بلاشک وشبہ قرآن وسنت ہی ہے، لہٰذا التسمیہ نے بھی انسانی روح کی تسکین اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسماء الٰہیہ کے ذکر کی تلقین کی ہے۔ وہ اسماء مبارکہ اللہ، الرحمٰن اور الرحیم ہیں۔ ان

کے بکثرت ذکر سے روحانی طور پر انسانی شخصیت پر وہی اثرات مترتب ہوتے ہیں جو ان کی صفاتی تجلیات میں مضمر ہیں۔ چنانچہ اللہ کا ذکر جہاں بے شمار فضائل و برکات اور اثرات وثمرات کا حامل ہے وہاں اس کی کثرت سے انسانی طبیعت میں استغناء اور قناعت کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ دل دنیوی حرص ولالچ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا کسی کا خوف وخطر دل میں نہیں رہتا اور انسان دنیا کے کسی بھی فرعون اور قارون کے سامنے نہیں جھک سکتا گویا ''اللہ'' کے ذکر سے اس کے انوار الوہیت انسان کے باطن کو اس طرح انقلاب آشنا کر دیتے ہیں کہ نہ اس کا دست سوال کسی غیر کے سامنے اٹھتا ہے اور نہ اس کا سر نیاز کسی غیر کے سامنے جھکتا ہے۔ اسی طرح الرحمٰن اور الرحیم کے اسماء مبارکہ کا ذکر روح انسانی کو صفت رحمت کی فراوانی عطا کرتا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

باری تعالیٰ کے اسماء مبارکہ پر مشتمل تسمیہ کے ہر کام سے پہلے پڑھے جانے کا حکم اس کے بکثرت ذکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انسان تسمیہ کا ذکر جس قدر کثرت کے ساتھ کرے گا۔ اس کی شخصیت اسی قدر صفات استغناء ورحمت سے مزین ہوگی۔ لیکن یہ ذکر محض حلق کی حد تک نہیں دل کی گہرائیوں سے ہونا چاہئے۔

(۱۰) رحمت حق سے مایوسی کی ممانعت

تسمیہ میں باری تعالیٰ کی صفت رحمت کو ''رحمٰن ورحیم'' دو اعلام کے ذریعے ظاہر کرنا اس عملی حکمت پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے پائے۔ انسان زندگی میں کئی بار ظاہری اسباب سے ناامید ہوتا ہے یا پریشانی واضطراب کی ہیجان انگیز کیفیات میں مبتلا ہوتا ہے تو اس پر حسرت ویاس کی گرد چھا جاتی ہے۔ وہ حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض حالات میں خودکشی جیسے قبیح فعل کے ارتکاب کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔ تسمیہ اسے مایوسیوں اور حسرتوں کے اندوہ ناک طوفانوں سے نجات پانے اور ذات رحمٰن ورحیم سے کامل امید وابستہ کر لینے کی دعوت دیتا ہے۔ گویا تسمیہ ہر قدم پر لاتقنطوا من رحمته اللہ کی ایسی ندا

ہے جو تھکے ماندے انسانوں کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دے دیتی ہے۔ ہر کام کے شروع کرنے پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ دوران جدوجہد ہزاروں مشکل مراحل پیش آتے ہیں۔ جن میں انسان مایوس اور پیشان ہونے لگتا ہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ معاملہ اس طرح انجام پائے جیسے اس شخص کی خواہش تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حالات میں انسان پریشان اور ناامید ہو کر شیوہ کفر اختیار کر لے۔ اس لئے بسم اللہ نے اسے ہر حال میں مطمئن رہنے اور بالآخر بہتر سے بہتر نتائج کی امید دلائی ہے۔ اگر کامیابی کی امید باقی نہ رہے تو انسان دل سے آمادہ پیکار نہیں رہتا۔ بھر پور جدوجہد کے لئے آمادگی منزل تک پہنچنے کی امید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے عمل کو ولولہ اور جوش و خروش میسر آتا ہے۔ لہٰذا تسمیہ کا اعلان رحمت قلب انسانی کو یہی دولت امید عطا کرتا ہے۔ جس کے باعث انسان کی بزم حیات اقصائے دہر میں ہر سو گرم ہی گرم نظر آتی ہے۔

(۱۱) خلق خدا سے حسن سلوک کی تعلیم

آیت بسم اللہ صرف اپنے معانی و مطالب کو سمجھنے اور ان سے ہمت عمل اخذ کرنے کا ہی نہیں بلکہ انسانوں کو یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ وہ خود کو تسمیہ کے رنگ میں مکمل طور پر رنگ لیں۔ ذات حق کی صفت رحمت جن دو عنوانات کے حوالے سے بیان کی گئی ہے وہ رحمانیت اور رحیمیت ہیں جیسے کہ پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ رحمانیت الٰہی ہر مومن و کافر پر یکساں عنایات کی پیغامبر ہے اور رحیمیت بالخصوص مومنین پر۔ گویا تسمیہ رحمت خداوندی کی اس قدر وسعت اور فراوانی کے بیان پر مشتمل ہے کہ خلق خدا میں سے کوئی فرد بھی اس سے محروم نہیں رہتا۔ تسمیہ کے مطالب کا انسان کی عملی زندگی میں زندہ حقیقت کے طور پر راسخ ہو جانا یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی صفت رحمت و شفقت کے اسی رنگ میں رنگا جائے۔ یعنی انسان کی ذات صفات الٰہیہ سے تخلق واتصاف کے باعث خود بھی اتنی رحیم و شفیق بن جائے کہ وہ پوری خلق خدا کے لئے سراپا رحمت و رافت ہو، نفع بخشی اور فیض بخشی کا پیکر ہو۔ اس کا دل انسانوں کی ہمدری اور بہی خواہی کا

مرکز ہو۔ دوست تو دوست دشمن بھی اس کے حسن سلوک سے پوری طرح فیضیاب ہوں، بقول حافظ شیرازیؒ

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

بے شک اسلام میں مرد مومن کی پہچان یہی ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے اور دوسروں کی اذیت اور تکلیف خود اس کے لئے سخت پریشانی کا باعث ہو۔ دوسروں کی بے آرامی اس کا اپنا چین وسکون سلب کرلے۔ الغرض اس کی حیثیت آنکھ کی سی ہو کہ جسم کے کسی بھی عضو کو درد ہو تو آنسو وہ بہاتی ہے۔ ٹیس کہیں بھی اٹھے، نینداس کی چھن جاتی ہے بقول شخصے

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

غالباً امیر مینائی نے انھیں جذبات کا اظہار یوں کیا ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تسمیہ میں بیان ہونے والے دونوں اوصاف انسان کو اپنے پرائے کا امتیاز مٹا کر سب کے لئے یکساں دردمند دل عطا کرنا چاہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اس مدعا کا بیان کیا خوب انداز میں فرمایا، جس کو امام بیہقیؒ نے حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہؓ سے اس طرح روایت کی ہے۔

الخلق عیال الله فاحب الخلق الی الله من احسن الی عیاله (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الاداب، باب الحب فی اللہ: ۴۲۵)	مخلوق، اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے پس اللہ کو مخلوق میں سے وہ شخص بہت زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے سے زیادہ اچھا سلوک کرے۔

اسی طرح حضرت انسؓ سے ایک اور حدیث یوں مروی ہے۔

من قضی لاحد من امتی حاجة یرید ان یسره بها فقد سرنی و من سرنی فقد سر الله ومن سر الله ادخله الله الجنة

(مشکواۃ المصابیح' کتاب الاداب' باب الحب فی اللہ: ۴۲۵)

جس نے میری امت میں سے کسی کی بھی کوئی حاجت روائی کی (یعنی اسے تکلیف سے نجات دی) اسے مسرت وسکون مہیا کرنے کے لئے تو اس نے بے شک مجھے خوشی پہنچائی اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اسے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا۔

یہاں سے مطلقاً یہ ثابت ہو گیا کہ ضرورت مندوں کی ضرورت کا پورا کرنا' پریشان حال لوگوں کی پریشانی کو دور کرنا' شکستہ دل' دکھی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کرنا عین اسلام اور بارگہ خداوندی میں قرب ومقبولیت کی علامت ہے۔ حضرت رومیؒ اسی فلسفہ اسلام کو یوں بیان کرتے ہیں۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آذر است
دل گزر گاہ جلیل اکبر است

ٹوٹے دلوں کو سکون اور اطمینان کی دولت عطا کرنا اس لئے سب اعمال سے افضل ہے کہ یہی ٹوٹے ہوئے دل رب ذوالجلال کا بسیرا ہوا کرتے ہیں۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے مکشوفات میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔

اذا رائیت الفقیر المحترق بنار الفقر والفاقه والمنکسر بکثرة الفاقة فتقرب الیه لانه لاحجاب بینی و بینه

جب تو کسی کو فقر کی آگ میں جلا ہوا اور فاقوں کی کثرت سے ٹوٹا ہوا دیکھے تو اس کا قرب حاصل کر کیونکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ اور دوری باقی نہیں رہتی۔

(الرسالۃ غوث الاعظمؒ: ۴۳)

مستزاد یہ کہ اسلام میں تو شرط ایمان ہی دوسروں کے لئے دل سوزی، ہمدردی اور نفع بخشی ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

لایومن احد کم حتی یحب لاخیه مایحب لنفسه

تم میں سے کوئی شخص ایماندار ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ (آرام، سکون، سہولت اور آسائش) پسند نہ کرے جو وہ اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، ۱:۶)

آیئے! اس معیار ایمان کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ ہم کس قدر خودغرضیوں، مفاد پرستیوں، ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں کی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔ کونسی زیادتی اور ظلم ایسا ہے جو ہم اپنے مفادات کی خاطر روا نہیں رکھتے، کونسی بد دیانتی ایسی ہے جو ہم اپنی منفعت کی خاطر جائز نہیں سمجھتے اور بجائے دوسرے لوگوں کی بہتری سوچنے کے انہیں پریشان کرنے کے لئے کونسا حربہ استعمال نہیں کرتے۔ پورے معاشرے میں کوئی کسی کا خیر خواہ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف دھوکہ اور دجل و فریب ہے، مکاری و عیاری کا بازار گرم ہے، ہر انسان خونخوار بھیڑیئے کی مانند دوسرے انسانوں کے خون سے اپنا منہ رنگ رہا ہے۔ چہروں پر منافقت مچلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، باہمی اعتماد کی فضا مفقود ہے۔ دوست دشمن ہیں، راہبر راہزن ہیں، ساتھی لٹیرے ہیں، ظاہر میں بڑے تقدس ماب دکھائی دینے والے باطن میں سب سے بڑے مجرم نظر آتے ہیں، بقول

اقبالؒ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اقبالؒ ایک مقام پر صورت حال کا تجزیہ یوں کرتے ہیں۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

الغرض ہم رحمت ورافت کا پیکر بننے کی بجائے مکر وشقاوت کا مجسمہ بن گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک پریشان ہے کہ وہ ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ چنانچہ بسم اللہ کا فلسفہ اور عملی حکمت وافادیت یہی ہے کہ ہم ''رحمٰن ورحیم'' کی صفاتی تجلیات سے خود کو آراستہ کر کے اپنے پرائے سب کے لئے پیغام رحمت بن جائیں۔ اور کوئی شخص سچ پر زیادتی بھی کرے تو اس کا بدلہ عفو ودرگزر سے دیں۔

جیسا کہ قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَo

(آل عمران، ۳: ۱۳۳۔۱۳۴)

جنت جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں، جو پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہین اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہےo

ایک اور مقام پر اللہ تعالی نے اپنے مقبول بندوں کے اسی کردار کو یوں بیان کیا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا o وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا o

(الفرقان، ۲۵: ۶۳۔۶۴)

اور (خدائے) رحمان کے (مقبول) بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور ان سے جاہل (اکھڑ) لوگ (ناپسندیدہ) بات کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے (ہوئے الگ ہو جاتے) ہیں اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں o

پہلی آیت میں حقوق العباد کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسری میں حقوق اللہ کی۔ متذکرہ بالا ارشادِ الٰہی سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوگئی ہے کہ مقبولانِ خدا نہ تو خود کسی کے لئے باعث تکلیف ہوتے ہیں اور نہ کسی کی زیادتی کے ردعمل میں اسے اذیت پہنچاتے ہیں۔ گویا ان کا وجود ہر ایک کے لئے ہر حال میں آسودگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ تسمیہ کا پیغام رحمت انسانی شخصیت کے اندر اسی بنیاد پر انقلابِ کردار کا داعی ہے۔

(۱۲) قدرتِ الٰہیہ کو محیطِ کُل سمجھنے کی تلقین

تسمیہ ذاتِ باری تعالیٰ کے تین ناموں پر مشتمل اللہ...... الرحمٰن...... الرحیم...... ''اللہ'' سے اس کی شانِ خالقیت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ حیات کائنات کا مبداء و مصدر وہی ایک ہی ہے۔ ہر شے کی ابتدا اسی کے فیضانِ قدرت سے ہوئی ہے۔ ''الرحمٰن'' سے دنیا میں اس کی بے پایاں رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام موجوداتِ عالم اسی کے فیضانِ قدرت سے قائم و دائم ہیں۔ ''الرحیم'' سے آخرت میں اس کی عنایات و انعامات کا ظہور ہوتا اور یہ پتہ ہے کہ ہر ایک کا حسنِ انجام اسی کے لطف و کرم پر منحصر ہے۔ گویا تینوں اسمائے الٰہی حیاتِ انسانی کے ''آغاز'' ''دوران'' اور ''انجام'' کی نسبت یہ خبر دیتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کی ابتداء ذاتِ حق کے چشمہ الوہیت کے فیضان سے ہے۔ اس کا وسطانی اور درمیانی عرصہ جو اس دنیا کی زندگی پر مبنی ہے

ذات حق کے چشمہ رحمانیت کے فیضان سے ہےاور اس کا انجام بھی جو آخرت کی صورت میں ہوگا ذات حق کے چشمہ رحیمیت کے فیضان کا مرہون منت ہوگا۔ لہٰذا انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تیری ساری زندگی اول سے آخر تک قدرت الٰہیہ کے فیضان وانعام کی محتاج ہے۔ تو اس کی شان الوہیت سے پیدا ہوا اس کی شان رحمانیت سے زندہ ہے اور اس کی شان رحیمیت سے اپنے انجام کو پہنچے گا۔ جب اس کی قدرت کاملہ حیات انسانی اور حیات کائنات کے تمام مراحل پر محیط ہے۔ اس کی عنایات کے بغیر نہ انسان کا آغاز ممکن تھا نہ زندگی ممکن ہے اور نہ انجام بہتر ہوگا تو آخر کیا وجہ ہے کہ تو اس احکم الحاکمین کی غلامی میں نہ رہے اور اس سے منہ موڑ کر اس دنیا کی بے ثبات رنگینیوں میں گم ہو جائے۔

تسمیہ کے اسمائے ثلاثہ (اللہ، الرحمٰن، الرحیم) سے جہاں انسانی زندگی کی خلق، معاش اور معاد، تینوں کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انسانی جدوجہد میں ہر عمل انہی تینوں مراحل سے گزرتا ہے۔ انسان کا ہر کام کبھی ابتدا کے مرحلے میں ہوتا ہے، کبھی وسط اور دوران کے مرحلے میں اور کبھی اپنی انتہا وانجام کے مرحلے میں۔ تسمیہ انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تیرا ہر کام اپنے آغاز کے لئے بھی رب کائنات کی توفیق وعنایات کا محتاج ہے۔ پھر اس کام کا جاری رہنا بھی اسی کے فضل وکرم سے ہوتا ہے اور اس کا اپنے اختتام تک پہنچنا بھی اسی کی رحمت کے باعث ہوتا ہے۔

اے انسان! اگر اول سے آخر تک رحمت باری تیرا ساتھ نہ دے تو تو کوئی کارنامہ بھی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اگر تیری جدوجہد کے دوران کسی وقت بھی اس کی توجہ اور التفات تجھ سے ہٹ جائے تو تیری ہر مہم ادھوری رہ جائے۔ جس طرح وہ ذات بغیر کسی شرط کے، تو جو کچھ بھی ہو خواہ تو اسے مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، تجھ پر اپنا لطف وکرم جاری رکھتی ہے۔ تو بھی اسی طرح ہر حال میں، خواہ تیری خواہشیں ظاہرا پوری ہوں یا نہ ہوں یاد رکھ، اس سے دل لگا اور اس کی اطاعت کر۔ اس طرح تیری ذات کندن بن جائے گی اور صفات باری تعالیٰ کا پرتو تجھے یگانہ روزگار کر دے گا۔

(۱۴) مکمل دستور حیات کی تعلیم

تسمیہ سے انسانی معاشرے کو مکمل دستور حیات کی رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ انسانی زندگی اجتماعی اور معاشرتی سطح پر تین قسم کے مسائل سے دوچار ہے اور انہی کے حل سے قوم کو صحیح راہ عمل میسر آتی ہے۔ حیات انسانی کے دستور کے تین مسائل یہ ہیں۔

سیاست' معیشت اور مذہب

سیاست حکومت واقتدار کے مسئلے سے بحث کرتی ہے۔ معیشت زندگی اور اس کے استحکام کے مسئلے سے بحث کرتی ہے۔ مذہب عقائد اور اعمال کے ضابطوں سے بحث کرتا ہے۔ اس تقسیم کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ سیاست کا مدعا ''قیام اقتدار'' ہے' معیشت کا مدعا ''بقاء حیات'' ہے اور مذہب کا مدعا ''حسن آخرت'' ہے۔

تسمیہ نے تینوں مسائل کے حل کے لئے رب ذوالجلال کی تین ہی شانوں کو نمایاں کر دیا۔ شان الوہیت' شان رحمانیت اور شان رحیمیت' اللہ تعالیٰ اپنی شان الوہیت کے اعتبار سے حکومت واقتدار کا سرچشمہ ہے وہی اپنی شان رحمانیت کے اعتبار سے دنیا میں انسانی زندگی کی بقاو دوام کا ضامن ہے اور وہی اپنی رحیمیت کے اعتبار سے آخرت میں حسن انجام کا باعث ہوگا۔ سیاست کا مسئلہ اس کے پرتو الوہیت سے حل ہوسکتا ہے۔ معیشت کا مسئلہ اس کے پرتو رحمانیت سے حل ہوسکتا ہے اور مذہب کا مسئلہ اس کے پرتو رحیمیت سے حل ہوسکتا ہے۔ گویا تسمیہ کے الفاظ پکار پکار کر بنی نوع انسان کو تنبیہہ کر رہے ہیں کہ ان مسائل حیات کے حل کے لئے مختلف سمتوں اور گوشوں کی طرف لپکنے کی بجائے صرف اور صرف اسلام کے دامن رحمت سے وابستہ ہو جاؤ۔ ذات حق تمہیں ہر الجھن پر قابو پانے کی توفیق عطا کر دے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہر مرحلے پر ہدایت' خلوص نیت اور پختہ یقین کے ساتھ اسلام سے ہی طلب کی جائے۔ اسی کا نام ''اخلاص فی التوحید'' ہے۔ وہ لوگ جو دامن اسلام کو ناکافی سمجھ کر صرف مذہبی احتیاج اس سے پوری کرتے ہیں اور سیاسی ہدایت کی بھیک مغربی جمہوریت یا آمریت وشہنشاہیت کے دامن سے مانگتے ہیں وہ گمراہ

ہیں۔ اسی طرح جو لوگ مذہبی اور اخلاقی ہدایت اسلام سے اخذ کر کے معاشی ہدایت کی بھیک اشتراکیت یا سرمایہ داریت کے دامن سے مانگتے ہیں وہ بھی گمراہ ہیں۔ اسلام کسی تثلیث یا ثنویت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا اپنا خرمن جود وسخا اتنا عظیم ہے کہ کچھ بھی کہیں اور سے لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تسمیہ اسلام کے اسی جامع دستور ہدایت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ رب کائنات کی ہستی ایسی نامکمل نہیں ہے کہ وہ تمہاری آخرت کے سنوارنے کا اہتمام تو کرے لیکن جس زندگی پر خود آخرت کے انجام کا انحصار ہے اس کے مسائل سنوارنے کا انتظام نہ کر سکے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انسانوں کو سیاسی ہدایت بھی نہ دے معاشی ہدایت بھی عطا نہ کرے اور پھر آخرت میں دنیوی زندگی کے تمام امور سے متعلق باز پرس اور جزا وسزا بھی ہو۔ اگر دنیوی زندگی کا حساب وکتاب ہونا ہے تو یقیناً اس زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی ضابطہ اور لائحہ عمل بھی دیا گیا ہوگا۔ جس کی اطاعت اور خلاف ورزی کے حوالے سے آخرت کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنی ''شان الوہیت'' کے بیان سے انسانوں کو سیاسی قوت واقتدار کے سرچشمے اور مبدا ومرکز کی طرف متوجہ کر دیا۔ پھر اپنی ''شان رحمانیت'' کے بیان سے انہیں مرکز معاش کی طرف متوجہ کر دیا اور آخر میں اپنی ''شان رحیمیت'' کے بیان سے انہیں مرکز معاد کی طرف راغب کر دیا۔ تاکہ نوع انسانی پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ انسانی زندگی کے سیاسی، معاشی اور مذہبی تمام پہلو اسی ایک در سے سنورتے ہیں اور تمام تر احتیاجات اسی ایک مرکز سے تسکین پاتی ہیں۔

(۱۴) خوف ورجاء کی تعلیم اور توازن

اسلام کا منشاء یہ ہے کہ انسانی شخصیت ہر لحاظ سے متوازن ہو۔ تسمیہ اسی اصول کے پیش نظر انسان کو ذات باری تعالیٰ کی نسبت ''خوف ورجاء'' دونوں کیفیتوں کو دل میں متوازن انداز سے جاگزیں کرنے کی تلقین کرتا ہے ''اللہ'' سے ذات حق کی عظمت وجبروت کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے انسان کے دل پر اس کی ہیبت وجلال کی کیفیتیں ''خوف'' کی حالت طاری کر دیتی ہے۔ لیکن خالق کائنات اپنے بندے کو محض خوف عقاب سے ہی خائف اور متوحش نہیں رکھنا چاہتا کہ

اس سے شخصیت کے غیر متوازن ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ ''الرحمٰن الرحیم'' کے اسماء اس کی رحمت وعنایت کی امید بھی دلا رہے ہیں اسے ''رجاء'' کہتے ہیں۔ خوف سے دل میں ہیبت پیدا ہوتی ہے اور امید ور جا سے انس ومحبت۔ شان الوہیت کے تصور نے انسان کو خوف و ہیبت کی حالت عطا کی' شان رحمانیت ورحیمیت نے امید ومحبت کی' اس طرح ''خوف اور امید'' دونوں نے مل کر عشق کو وہ آداب سکھا دیئے جو بارگاہ محبوب کے شایان شان تھے' بقول میرؔ

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

قرآن حکیم بندوں کو اپنے رب سے ایسے ہی تعلق کی تعلیم دیتا ہے جو خوف وامید دونوں سے آراستہ ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔ (السجدہ' ۳۲:۱۶)

وہ اپنے رب کو خوف اور امید کی ملی جلی حالت میں پکارتے ہیں۔

شیخ ابوعلی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ خوف اور امید انسان کے دو پر ہیں۔ دونوں صحیح ہوں تو پرواز ٹھیک ہوگی۔ اگر ایک بھی ناقص ہو تو پرواز نا تمام رہے گی۔ خوف اور امید دونوں مل کر توبہ کا محرک بنتے ہیں ان میں سے ایک کا بھی فقدان ہو تو انسانی زندگی لذت توبہ سے محروم ہو جائے۔ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ ایک ایسے آدمی کے پاس تشریف لائے جو حالت نزع میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''تمھارا کیا حال ہے؟'' اس نے کہا ''میری حالت یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے خائف ہوں لیکن خدا کی رحمت کا امیدوار ہوں'' حضور ﷺ نے فرمایا ''جب مومن کے دل میں امید وبیم کی دونوں حالتیں اس طرح جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کی امید بر لاتا ہے۔''
آنحضرت ﷺ نے فضیلت خوف کا بیان اس طرح فرمایا۔

لایدخل النار من بکی من خشیه اللہ — جو شخص خدا کے خوف میں رویا، دوزخ میں نہیں جائے گا۔

(جامع ترمذی، باب فضائل الجہاد، ۱:۱۹۶)

اور دوسرے مقام پر فضیلت امید کا بیان اس طرح فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ یوم آخرت میں فرمائیں گے۔

عبدی ما عبدتنی و رجوتنی و لم تشرک بی شیئا غفرت لک علی ما کان منک، — میرے بندے تو نے شرک کئے بغیر میری جو عبادت کی پر امید رہتے ہوئے کی (میں نے اس کے بدلے میں) جو کچھ تو نے کیا تھا۔ سب تیری خاطر معاف کر دیا۔

(جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ۲:۱۹۳)

چنانچہ تسمیہ اسی تعلیم کا نچوڑ ہے کہ ''اللہ'' کا نام جو اس کی یکتائی و کبریائی کو ظاہر کرتا ہے۔ بندے کے دل میں اس کا خوف پیدا کر دے۔ ''الرحمٰن الرحیم'' کے نام اس کی رحمت ومغفرت کی امید دلا دیں۔ اس طرح بندہ اس محبوب حقیقی سے ایسا تعلق پیدا کرے کہ اس کا ڈر بھی ہو اور انس و محبت بھی۔

(۱۵) مراتب عروج ونزول کی تعلیم

عروج اور نزول تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ عروج میں ''سیر من اللہ'' ہوتی ہے اور نزول میں ''سیر الی اللہ'' سے مراد یہ ہے کہ بندہ دنیا و مافیھا سے بے رغبت ہو کر ذات حق کے قرب و وصال کی منزلوں کو طے کرتا چلا جائے۔ اور بارگاہ الوہیت میں پہنچ کر اس طرح گم ہو کہ خود کو معدوم پائے۔ اس راہ میں حسن محبوب کے جلوے دیکھ کر عارف یہ تقاضا کرتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

یہ مقام فنا ہے جس کے بغیر بقاء نصیب نہیں ہو سکتی۔ خواجہ اجمیریؒ فرماتے ہیں۔

دلا بحلقہ رندان بزم عشق درآ
کہ جرعہ ز شراب دہند ترا
اگر بقا طلبی اولت فنا باید
کہ تا فنا نشوی رہ نمی بری بہقاء

عروج یعنی سیر الی اللہ کا مرحلہ جو مقام فنا پر منتج ہوتا ہے پہلے آتا ہے اور ذات الوہیت میں فنا ہو جانے کے بعد جب بقا ملتی ہے تو بندہ خود اس کی نعمتوں اور عنایتوں کا منبع و سرچشمہ ہو کر واپس لوٹتا ہے۔ پھر اسے انسانیت کی رہبری اور رہنمائی کا منصب سونپ دیا جاتا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے جلووں میں گم ہو کر واپس لوٹ آنا نزول ہے اسی کو ولایت محمدی ﷺ بھی کہتے ہیں۔ پہلے مقام پر بندہ خود کو اس کی ذات میں گم پاتا ہے تو ''انا الحق'' پکار اٹھتا ہے۔ لیکن نزول تام کے بعد جلوہ ذات سامنے بے نقاب بھی ہو تو پھر بھی شعور بندگی گم نہیں ہوتا، بقول اقبالؒ

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

''بسم اللہ'' میں سیر الی اللہ تھی جس کا کمال ''دیدار ذات'' اور ''فناء نفس'' تھا۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ بندہ تعینات بشریت کو چاک کر کے جلوہ الوہیت میں اس طرح گم ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی باقی نہ رہے جسے اقبالؒ یوں بیان کرتا ہے

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رستن از بند جہات است

یہ حقیقت ہے کہ مرتبہ عروج میں خود کو معدوم کئے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت رومیؒ فرماتے ہیں

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدن ہر چیز را شرط است ایں

جس طرح سایہ دیوار میں گم ہو کر اس کی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ اسی طرح بندہ ذات الوہیت میں گم ہو کر اس کی حقیقت کی راہ کو پا لیتا ہے۔ اقبالؒ نے ایک اور مقام پر بندے کی مرتبہ عروج میں اس تشویش اور اس کے حل کو ان سوالات و جوابات کی صورت میں بیان کیا ہے۔

من کیم، تو کیستی، عالم کجا است؟
درمیان ما و تو دوری چرا ست؟
من چرا در بند تقدیرم بگو؟
تو نمیری من چرا میرم بگو؟

جواب

بودہ اندر جہاں چار سو
ہر کہ گنجد اللہ او میرد در او
زندگی خواہی خودی را پیش کن
چار سو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیتی
در جہاں چوں مردی وچوں زیستی

لیکن یہی مرتبہ عروج ہی اگر آخری نکتہ کمال ہو تو انسانیت شرف ہدایت سے محروم رہ جائے۔ کیونکہ انبیاء و اولیاء سب ذات حق کے جلوہ حسن میں گم رہیں اور گمراہیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو راہ حق دکھانے کے لئے کوئی بھی مرد مومن مخلوق کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے۔ اس لئے عروج کے بعد نزول کا مرحلہ رکھا گیا۔ عروج دراصل اپنی ذات کی تکمیل کی کوشش تھی۔ نزول باقی انسانیت کی تکمیل کی کوشش ہے۔ عروج کا کمال لازم تھا نزول کا متعدی ہے۔ عروج اس لحاظ

سے ذاتی منفعت پر مبنی تھا لیکن نزول دوسروں کے لئے نفع بخشی اور فیض رسانی پر مبنی ہے۔ مقام نزول پر بندہ بارگہ الوہیت سے نعمتوں اور رحمتوں کو سمیٹ کر واپس خلق خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جس کا اشارہ ''الرحمٰن الرحیم'' میں ہے کیونکہ لفظ ''اللہ'' کی شان جلالیت میں خدا کے سوا سب کچھ معدوم نظر آتا تھا مگر الرحمٰن الرحیم کی شان رحمت میں سب کو بقا ملتی دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کا کمال یہ تھا کہ وہی باقی اور موجود رہے اور اس کے علاوہ سب کچھ فانی و معدوم' لیکن الرحمٰن الرحیم کا کمال یہ ہے کہ وہ مبقی اور موجد (بقا دینے والا اور ایجاد کرنے والا) بھی ہو یعنی وہ بھی رہے اور اس سے مانگنے والے بھی رہیں۔ اللہ اپنی صفت جلال سے ہر شے کو نیست کرنے والا ہے لیکن الرحمٰن الرحیم اپنی صفت جمال سے ہر شے کو ہست کرنے والا ہے۔

اسی لئے اللہ سے تعلق مقام فنا کا باعث تھا اور الرحمٰن الرحیم سے تعلق مقام بقا کا باعث ہے۔ تسمیہ کے ان معارف نے عام انسان کو بھی یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو دونوں خواص سے بہرہ ور کرے۔ بصورت عروج اپنی تکمیل بھی کرے اور بصورت نزول دوسروں کی نشوونما اور تکمیل سے بھی بے نیاز نہ ہو۔

(۱۶) حقیقت انسانی کی یاد کی تکمیل

تسمیہ میں تینوں اسماء الٰہی ...... اللہ' الرحمٰن' الرحیم اپنے اپنے معنوی تشخصات کے اعتبار سے انسان کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ اے انسان! یہ دنیا جس میں تو بس رہا ہے' تیرا منتہائے مقصود یا منزل سفر نہیں ہے۔ ابھی تک تو حالت سفر میں ہے۔ تیری زندگی کا وہ نقطہ آغاز تھا جب تجھے حالت عدم سے خلعت وجود سے نوازا گیا۔ یہاں سے تیرے سفر زندگی کی ابتدا ہوگئی۔ جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' انسانی سفر کا آغاز رب کائنات کی ''شان الوہیت'' کے ظہور سے ہوا کیونکہ الوہیت اصلاً خالقیت پر دلالت کرتی ہے اس طرح تو عالم ارواح میں مقیم رہا۔ پھر ذات حق نے جب چاہا تجھے اس عالم ناسوت (عالم دنیا) میں منتقل کر دیا۔ جہاں تجھے اس کے ''چشمہ رحمانیت'' کے ذریعے حیات کی نعمت مل رہی ہے۔ لیکن تو اس کارخانہ حیات کو اپنی منزل کیوں سمجھ بیٹھا ہے؟ یہ تو تیرے

سفر کا ایک مرحلہ ہے۔ ابھی ذاتِ حق کی ’’شانِ رحیمیت‘‘ کے جلوے کو بھی ظاہر ہونا ہے اور وہ عالمِ آخرت کا مرحلہ ہوگا۔ جہاں تیرے عارضی سفر کا اختتام ہو جائے گا اور تو پھر اپنی اصل حالت عدم پا سکے گا۔ یہاں پہنچ کر خدا کی ذات وصفات کے جلووں سے وصال کے بعد کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ تیری حالت فراق پھر سے حالت وصال میں بدل جائے گی۔ اس لئے تجھے چاہئے کہ تو اپنی اصلی حالت کو ہمہ وقت یاد رکھے۔ اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے ماہی بے آب کی طرح بیتاب رہے اور محبوب سے ملنے کی تیاری میں ہر گھڑی مصروف رہے۔ کیونکہ اس وقت فراق و جدائی کے حال میں ہے۔ ہجر و فراق کی حالت میں گرفتار لوگ اس طرح خوش وخرم اور بے فکر و بے نیاز نہیں ہوا کرتے جس طرح تو نظر آتا ہے۔ تیری حالت تو اس بانسری کی سی ہونی چاہیے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر ہر وقت درد بھرے نغمات الاپتی رہتی ہے۔ جس کی حالت فراق کو حضرت رومیؒ نے اس طرح قلمبند کیا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا کہ بگویم شرح درد اشتیاق

تسمیہ نے شروع میں لفظ اللہ سے انسان کو اس کی خلقت کی یاد دلائی۔ الرحیم کے ذریعے اسے اپنے انجام اور آخری منزل کی طرف متوجہ کیا اور درمیان میں الرحمٰن کہہ کر اس دنیا کی زندگی کو بیان کر دیا تا کہ انسان اپنی سابقہ اصل کو یاد رکھے۔ آئندہ منزل کے لئے تیار رہے اور دنیوی زندگی کو بجائے حقیقت سمجھنے کے محض اپنی سفرِ زندگی کا ایک مرحلہ تصور کرے اسی لئے قرآن حکیم نے انسان کو اس کے اصل ٹھکانے کی طرف رغبت دلاتے ہوئے اعلان کیا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ۔

(العنکبوت'۲۹:۵)

جو کوئی ذات حق سے وصال کی آرزو رکھتا ہے (وہ سن لے) کہ وہ ملاقات اور وصال کی) گھڑی قریب آنے والی ہے۔

www.MinhajBooks.com

آیات طیبات

www.MinhajBooks.com

نمبر شمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	الفاتحة: ۱		
۱	الحمد للّٰه رب العالمينO	۱:۱	۷۴
	البقره:۲		
۲	وإذا خلوا الى شياطينهم...	۱۴:۲	۳۲
۳	يضل به كثيرا و يهدى به كثيرا...	۲۶:۲	۵۱
۴	إذ قال ربک للملائكة۔	۳۰:۲	۷۰
۵	وعلم آدم الأسماء كلها...	۳۱:۲	۱۰۸، ۱۱۱
۶	انه هوا التواب الرحيمO	۵۴:۲	۱۶۵
۷	ولله المشرق والمغرب...	۱۱۵:۲	۷۶، ۱۵۵
۸	إذ قال لبنيه ما تعبدون...	۱۳۳:۲	۱۳۴
۹	ولنا أعمالنا ولكم أعمالكم...	۱۳۹:۲	۲۱۲
۱۰	ويكون الرسول عليكم شهيدا۔	۱۴۳:۲	۱۶۷
۱۱	إن الله بالناس لرؤف الرحيم O	۱۴۳:۲	۱۶۵
۱۲	يأيها الذين أمنوا أستعينوا...	۱۵۳:۲	۸۲
۱۳	والفک التى تجرى فى البحر...	۱۶۴:۲	۱۷۷
۱۴	والذين أمنوا أشد حبا لله...	۱۶۵:۲	۱۴۳
۱۵	و اذا سألک عبادى عنى فانى قريب۔	۱۸۶:۲	۱۵۲
۱۶	أجيب دعوة الداع...	۱۸۶:۲	۱۸۵
۱۷	يا أيها الذين أمنوا أدخلوا فى السلم...	۲۰۸:۲	۲۱۱
۱۸	عسى أن تكرهوا شيئا و هو ...	۲۱۵:۲	۲۰۴
۱۹	أولئک يرجون رحمة اللّٰه ...	۲۱۸:۲	۱۶۵
۲۰	كذالک يبين اللّٰه لكم الأيات...	۲۱۹:۲	۱۳۸
۲۱	تلک الرسل فضلنا بعضهم...	۲۵۳:۲	۸۷
۲۲	تعر فهم بسيما هم۔	۲۷۳:۲	۱۰۱
۲۳	الذين يا كلون الربوا لا يقومون...	۲۷۵:۲	۴۰
	آل عمران: ۳		
۲۴	قل إن كنتم تحبون الله ...	۳۱:۳	۹۴، ۲۱۹
۲۵	وجنة عرضها السموات والأرض...	۱۳۳:۳، ۱۳۴	۲۳۷
۲۶	يتلوا عليهم اياته ويزكيهم...	۱۶۴:۳	۵۳
۲۷	الذين يذكرون اللّٰه قياما...	۱۹۱:۳	۱۳۷

نمبر شمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	النساء: ۴		
۲۸	إن اللّٰه كان توابا رحيماO	۱۶:۴	۱۸۳
۲۹	إن اللّٰه كان غفورا رحيماO	۲۳:۴	۱۸۳
۳۰	فكيف إذا جئنا من كل أمة...	۴۱:۴	۱۶۷
۳۱	يآيها الذين أمنوا لا تقربوا الصلاة...	۴۳:۴	۲۲۲
۳۲	ان اللّٰه كان سميعا بصيراO	۵۸:۴	۱۶۷
۳۳	يريدون ان يتحاكموا...	۶۰:۴	۲۰۸
۳۴	و قد أمروا أن يكفروا به...	۶۰:۴	۲۰۸
۳۵	و اذ قيل لهم تعالوا الى ...	۶۱:۴	۸۷
۳۶	و ما ارسلنا من رسول...	۶۴:۴	۸۹
۳۷	لوجد الله توابا رحيما O	۶۴:۴	۱۸۳
۳۸	قل كل من عنداللّٰه...	۷۸:۴	۱۵۷،۷۳
۳۹	ما اصابک من حسنة فمن اللّٰه ...	۷۹:۴	۷۳
۴۰	درجت منه و مغفرة و رحمة...	۹۶:۴	۱۸۴
۴۱	و استغفراللّٰه إن اللّٰه كان ...	۱۰۶:۴	۱۸۴
۴۲	لعنة اللّٰه و قال لأتخذن...	۱۱۹،۱۱۸:۴	۴۴
	ا لمائده: ۵		
۴۳	واذكروا اسم اللّٰه عليه۔	۴ :۵	۱۰۴
۴۴	اذا قمتم الى الصلوة فاغسلوا...	۶:۵	۲۲
۴۵	أحل لكم صيد البحر ...	۹۶:۵	۱۷۷
	الانعام: ۶		
۴۶	كتب على نفسه الرحمة۔	۱۲:۶	۱۹۵
۴۷	و هو يطعم ولا يطعم...	۱۴:۶	۱۵۶
۴۸	فقل سلام عليكم كتب...	۵۴:۶	۱۹۵
۴۹	سبحانه و تعالى عما يصفونO	۱۰۱:۶	۱۴۹
۵۰	لا تدركه الابصار و هو...	۱۰۳:۶	۱۳۷
۵۱	و كذلک جعلنا لكل نبی عدوا...	۱۱۳:۶	۳۲
۵۲	فكلوا مما ذكر اسم اللّٰه عليه۔	۱۱۸:۶	۱۱۴،۶۷
۵۳	ومالكم الاتاكلوا مما...	۱۱۹:۶	۱۰۴،۶۷
۵۴	وان الشياطين ليوحون الى...	۱۲۱:۶	۳۳

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
۵۵	وربک الغنی ذو الرحمة۔	۱۳۳:۶	۱۷۰
۵۶	و هو الذی أنشاء جنت معروشات...	۱۴۲:۶	۱۹۷
۵۷	ربکم ذو رحمة واسعة۔	۱۴۷:۶	۱۹۰
۵۸	قل إننی هدانی ربی إلی...	۱۶۱:۶_۱۶۲	۲۱۳
	الاعراف: ۷		
۵۹	ولقد مکنکم فی الأرض...	۱۰:۷	۱۷۶
۶۰	ثم قلنا للملائکة اسجدوا...	۱۱:۷_۱۳	۲۸
۶۲	قال فبما اغویتنی لأقعدن...	۱۶:۷	۵۰
۶۳	ثم لأ تینهم من بین ایدیهم...	۱۷:۷	۴۳
۶۴	قال اخرج منها مذء و ما مدحولا۔	۱۸:۷	۲۹
۶۵	فوسوس لهما الشیطان۔	۲۰:۷	۳۳
۶۶	انه یراکم هو و قبیله ...	۲۷:۷	۴۰
۶۷	فریقا هدی و فریقا حق...	۳۰:۷	۴۰
۶۸	قال یا قوم اعبدوا اللّٰه مالکم...	۶۵:۷	۱۳۵
۶۹	قال موسی لقومه استعینوا...	۱۲۸:۷	۸۲
۷۰	و رحمتی و سعت کلی شئ۔	۱۵۶:۷	۱۹۰
۷۱	وللّٰه الأسماء الحسنی فادعوه...	۱۸۰:۷	۱۰۲
۷۲	و اما ینزغنک من الشیطان نزغ...	۲۲۰:۷	۲۳
	الانفال: ۸		
۷۳	إنما المومنون الذین إذا...	۲:۸_۳	۱۴۱
	التوبه: ۹		
۷۴	لاتحزن ان اللّٰه معنا...	۴۰:۹	۷۸
۷۵	أولئک سیرحمهم اللّٰه إن اللّٰه ...	۷۱:۹	۱۷۰
۷۶	لقد جآء کم رسول من انفسکم...	۱۲۸:۹	۱۶۶
	یونس: ۱۰		
۷۷	ما خلق اللّٰه ذالک الا بالحق...	۵:۱۰_۶	۱۳۷
۷۸	فکفی با اللّٰه شهیدا۔	۲۹:۱۰	۱۶۷
	هود: ۱۱		
۷۹	قال ارکبوا فیها بسم اللّٰه مجریها...	۴۱:۱۱	۶۶، ۸۰

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	يوسف : ۱۲		
۸۰	وقال يا بنى لا تدخلوا من باب . . .	۶۷:۱۲	۳۵
۸۱	و ابيضت عينه من الحزن۔	۸۴:۱۲	۱۱۸
۸۲	اذهبوا بقميصى هذا فالقوه. . .	۹۳:۱۲	۱۱۷
۸۳	فلما ان جآء البشير القه. . .	۹۶:۱۲	۱۱۷
	الرعد: ۱۳		
۸۴	و هو الذى مد الارض وجعل. . .	۳:۱۳_۴	۱۷۶
۸۵	قل من رب السموت والارض. . .	۱۶:۱۳	۱۲۷
۸۶	الا بذكر اللّٰه تطمئن القلوبO	۲۸:۱۳	۱۴۱
	ابراهيم: ۱۴		
۸۷	اللّٰه الذى خلق السموت والأرض. . .	۳۲:۱۴_۳۴	۱۹۸
۸۸	سخر لكم الشمس والقمر. . .	۳۳:۱۴	۱۸۱
۸۹	واتكم من كل ما سالتموه۔	۳۴:۱۴	۱۸۵
	الحجر: ۱۵		
۹۰	واذ قال ربك للملائكة إنى. . .	۲۸:۱۵	۳۰
۹۱	فإذا سويته و نفخت فيه من. . .	۲۹:۱۵، ۳۵	۳۹
۹۲	قال رب بما اغويتنى لا زينن. . .	:۱۵	۴۳
	النحل : ۱۶		
۹۳	والأنعام خلقها لكم فيها. . .	۵:۱۶_۴	۱۷۸
۹۴	وهو الذى سخر البحر لتاكلوا. . .	۱۴:۱۶	۱۷۷
۹۵	ومالكم من نعمة فمن اللّٰه۔	۵۳:۱۶	۱۵۹
۹۶	وإن لكم فى الأنعام لعبرة. . .	۶۶:۱۶	۱۷۸
۹۷	واللّٰه أخرجكم من بطون. . .	۷۸:۱۶	۱۹۶
۹۸	واللّٰه جعل لكم من بيوتكم. . .	۸۰:۱۶	۱۷۹
۹۹	واللّٰه جعل لكم مما خلق. . .	۸۱:۱۶	۱۸۰
۱۰۰	فاذا قرأت القرآن فاستعذ. . .	۹۸:۱۶	۲۱، ۵۰
۱۰۱	انه ليس له سلطان. . .	۹۹:۱۶	۴۵
	بني اسرائيل: ۱۷		
۱۰۲	قل ادعوا اللّٰه او ادعوا الرحمن. . .	۱۱۰:۱۷	۱۶۲

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	مريم: ۱۹		
۱۰۳	قال إنما أنا رسول ربک...	۱۹:۱۹	۱۱۹
۱۰۴	رب السموت والأرض وما...	۶۵:۱۹	۱۳۰
۱۰۵	ان دعواللرحمن ولداً...	۹۳_۹۱:۱۹	۱۶۳
	طه: ۲۰		
۱۰۶	الرحمن على العرش استوىO	۵:۲۰	۱۷۲
۱۰۷	اللّٰه لا اله الا هو...	۸:۲۰	۱۰۳
۱۰۸	قال ربنا الذی أعطی...	۵۰:۲۰	۱۷۴
۱۰۹	وان ربکم الرحمن فاتبعونی...	۹۰:۲۰	۱۶۳
	الانبياء: ۲۱		
۱۱۰	وما ارسلنا من قبلک من...	۲۵:۲۱	۱۳۵
۱۱۱	وما ارسلنک الا رحمة للعالمين O	۱۰۷:۲۱	۹۵
	المومنون: ۲۳		
۱۱۲	وهو يجير ولا يجار عليه۔	۸۸:۲۳	۱۵۶
۱۱۳	و قل رب أعوذ بک من همزت...	۹۸_۹۷:۲۳	۲۳
	الفرقان: ۲۵		
۱۱۴	ثم استوى على العرش الرحمن...	۶۰_۵۹:۲۵	۱۶۳
۱۱۵	و عبادالرحمن الذين يمشون...	۶۴_۶۳:۲۵	۱۴۴، ۲۳۷
	الشعراء: ۲۶		
۱۱۶	قالوا لئن لم تنته يا نوح...	۱۱۶:۲۶	۲۷
	النمل: ۲۷		
۱۱۷	انه من سليمان و انه...	۳۰:۲۷	۶۲، ۶۶
	بسم الله الرحمن الرحيمO	۳۰:۲۷	۱۱۲
	القصص: ۲۸		
۱۱۸	ومن رحمته جعل لكم الليل...	۷۳:۲۸	۱۹۶
۱۱۹	لا اله الا هو كل شی هالک...	۸۸:۲۸	۷۶، ۱۵۴
	العنكبوت: ۲۹		
۱۲۰	من کان يرجوا لقاء اللّٰه...	۵:۲۹	۲۴۸
۱۲۱	خلق اللّٰه السموات والأرض...	۴۴:۲۹	۲۲۴

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
۱۲۲	ولئن سألتهم من خلق السموات ...	۶۱:۲۹	۱۲۷
۱۲۳	ولئن سالتهم من نزل من السماء...	۶۳:۲۹	۱۲۷
	الروم: ۳۰		
۱۲۴	للّٰه الامر من قبل و من بعد۔	۴:۳۰	۷۶
۱۲۵	او لم یتفکروا فی انفسهم۔	۸:۳۰	۱۳۸
۱۲۶	اللّٰه یبدؤ الخلق ثم یعیده...	۱۱:۳۰	۱۲۸
۱۲۷	و من اٰیاته أن خلق لکم...	۲۱:۳۰	۱۹۷
۱۲۸	اللّٰه الذی خلقکم ثم رزقکم...	۴۰:۳۰	۱۲۸
	لقمان: ۳۱		
۱۲۹	وأسبغ علیکم نعمه ظاهرة باطنة۔	۲۰:۳۱	۱۹۵
۱۳۰	ألم تروا أن اللّٰه سخرلکم...	۲۰:۳۱	۱۸۱
	السجده: ۳۲		
۱۳۱	اللّٰه الذی خلق السموت و الارض...	۴:۳۲	۱۲۸
۱۳۲	یدعون ربهم خوفا طمعا۔	۱۶:۳۲	۲۴۱
	الاحزاب: ۳۳		
۱۳۳	و کان بالمؤمنین رحیماO	۴۳:۳۳	۱۷۲
	السباء: ۳۴		
۱۳۴	قل من یرزقکم من السموت...	۲۴:۳۴	۱۲۷
	فاطر: ۳۵		
۱۳۵	ان الشیطان لکم عدو...	۶:۳۵	۴۹
	یسین: ۳۶		
۱۳۶	الذی جعل لکم من الشجر الأخضر...	۸۰:۳۶	۱۸۰
	الصافات: ۳۷		
۱۳۷	سبحان ربک رب العزة عما یصفونO	۱۸۵:۳۷	۱۴۹
	ص: ۳۸		
۱۳۸	قال فبعزتک لاغوینهم...	۸۲:۳۸_۸۳	۴۲
۱۳۹	قال فالحق و الحق اقول...	۸۴:۳۸_۸۵	۴۲
	الزمر: ۳۹		
۱۴۰	ما نعبدهم الا لیقربونا...	۳:۳۹	۱۳۱

www.MinhajBooks.com

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	المومن: ۴۰		
۱۴۱	ربنا وسعت كل شى رحمة و علما۔	۷:۴۰	۱۹۰
۱۴۲	اللّٰه الذى جعل لكم الأرض...	۶۴:۴۰	۲۲۶
	حم السجده: ۴۱		
۱۴۳	فاستعذ باللّٰه انه هو السميع العليم O	۳۶:۴۱	۲۳
۱۴۴	سنريهم اياتنا فى الأفاق...	۵۳:۴۱	۱۳۸، ۱۴۷
	الزحرف: ۴۳		
۱۴۵	أجعلنا من دون الرحمن ألهة...	۴۵:۴۳	۱۶۴
	الدخان: ۴۴		
۱۴۶	ما خلقنا هما الابالحق...	۳۹:۴۴	۲۲۴
	محمد: ۴۷		
۱۴۷	فلا تهنوا و تدعوا الى السلم...	۳۵:۴۷	۴۸، ۷۹، ۲۲۲
	الفتح: ۴۸		
۱۴۸	لن تجد لسنة اللّٰه تبديلا O	۲۳:۴۸	۹۰
۱۴۹	سيماهم فى وجوههم من اثر السجود۔	۲۹:۴۸	۱۰۱
	الحجرات: ۴۹		
۱۵۰	يأيها الذين أمنوا لا تقدموا بين...	۱:۴۹	۷۱
	ق: ۵۰		
۱۵۱	ولقد خلقنا الانسان ونعلم...	۱۶:۵۰	۷۹
	و نحن أقرب اليه من حبل الوريد O	۱۶ :۵۰	۱۵۲
	الذاريات: ۵۱		
۱۵۲	و بالأسحارهم يستغفرونO	۱۸:۵۱	۱۴۵
۱۵۳	و فى الأرض ايات للموقنين...	۲۰:۵۱	۲۲۵
	الواقعه: ۵۶		
۱۵۴	لا يمسه الا المطهرونO	۷۹:۵۶	۵۴
	الحديد: ۵۷		
۱۵۵	هو الاول و ألاخر و الظاهر...	۳:۵۷	۷۵، ۱۵۰
۱۵۶	وهو معكم أين ما كنتم...	۴:۵۷	۷۸، ۱۵۴

www.MinhajBooks.com

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	الحشر: ۵۹		
۱۵۷	هو اللّٰه الذی لا اله الا هو...	۲۲:۵۹	۱۲۶
۱۵۸	هو اللّٰه الذی لا اله الا هو الملک...	۲۳:۵۹	۱۲۶
۱۵۹	هو اللّٰه الخالق الباری المصور...	۲۴:۵۹	۱۲۶،۱۰۳
	المنافقون: ۶۳		
۱۶۰	وإذا قيل لهم تعالوا يستغفرلکم...	۵:۶۳	۸۸
۱۶۱	سوآء عليهم استغفرت لهم...	۶:۶۳	۸۹
	الملک: ۶۷		
۱۶۲	ولقد زينا السمآء الدنيا...	۵:۶۷	۲۷
	المزمل: ۷۳		
۱۶۳	واذکر اسم ربک و تبتل...	۸:۷۳	۱۰۴
	الدهر: ۷۶		
۱۶۴	هل أتی علی الانسان حين...	۱:۷۶	۱۷۳
۱۶۵	انا خلقنا الانسان من نطفة...	۲:۷۶	۱۶۶
	التکوير: ۸۱		
۱۶۶	وما هو بقول شيطان الرجيمO	۲۵:۸۱	۳۱
	الاعلی: ۷۸		
۱۶۷	قد افلح من تزکی و ذکر...	۷۸:۱۴ـ۱۵	۱۰۵
	الانفطار: ۸۲		
۱۶۸	يأأيها الناس ما غرقک بربک...	۸۲:۶ـ۸	۱۷۶
	الضحیٰ: ۹۳		
۱۶۹	وللأخرة خيرلک من الاولیO	۴:۹۳	۹۳
۱۷۰	ولسوف يعطيک ربک فترضی...	۵:۹۳ـ۸	۹۱
۱۷۱	فاما اليتيم فلا تقهر...	۹:۹۳ـ۱۱	۹۲
	الانشرح: ۹۴		
۱۷۲	فان مع العسر يسرا...	۵:۹۴ـ۶	۲۰۱
	التين: ۹۵		
۱۷۳	لقد خلقنا الإنسان فی أحسن تقويمO	۴:۹۵	۱۹۶

نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	العلق:۹۶		
۱۷۴	اقراء باسم ربک الذی خلق O	۱:۹۶	۶۸، ۱۰۵
	الاخلاص: ۱۱۲		
۱۷۵	قل ھو اللّٰہ احدO اللّٰہ الصمد...	۱۱۲:۱۔۴	۱۳۶
	الفلق: ۱۱۳		
۱۷۶	و من شر النفثت فی العقد O	۱۱۳:۴	۳۴
۱۷۷	و من شر حاسد اذا حسدO	۱۱۳:۵	۳۴
	الناس:۱۱۴		
۱۷۸	من شر الوسواس الخناس...	۱۱۴:۵۔۶	۳۳

نمبرشمار	اشعار	صفحہ

اشعار

www.MinhajBooks.com

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۱	اللّٰہ یغضب ان ترکت سواله و بنی آدم حین سئال یغضب	۱۸۶
۲	أليس وعدتنی يا قلب عنی اذا ما تبت عن لیلیٰ تتوب فھا انا تائب عن حب لیلیٰ فما لک کلما ذکرت تذوب	۱۴۲
۳	یا من الوذ به فیما او مله ومن اعوذ به من احاذره	۲۴
۴	آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است پس قیامت شوٗ قیامت را ببیں دیدن ہر چیز را شرط است ایں	۲۴۴
۵	آسائش دوگیتی تفیسر ایں دو حرف است با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا	۲۳۴

www.MinhajBooks.com

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
٦	اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی راہ فاش تر دیدن بیاموز اگر زیری ز خود گیری زبر شود خدا خواہی بخود نزدیک تر شو	۱۴۸
۷	اے بروں از وہم و قال و قیل من خاک بر فرق من و تمثیل من	۱۳۶
۸	بشنو از نے چوں حکایت می کند و ز جدائی ہا شکایت می کند کز نیستان تا مرا ببریدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تاکہ بگویم شرح درد اشتیاق	۲۴۷
۹	بودہ اندر جہاں چار سو ہر کہ گنجد اندر او میرد در او زندگی خواہی خودی را پیش کن چار سو را غرق اندر خویش کن باز بینی من کیم تو کیستی در جہاں چوں مردی و چوں زیستی	۲۴۵

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۱۰	بو علی اندر غبار ناقہ گم دست رومی پردہ محمل گرفت	۱۳۹
۱۱	چوں ایں جا بے خودی آورد ہوش عبارت را اشارت گفت خاموش	۱۵۳
۱۲	چیست دیں؟ در یافتن اسرار خویش زندگی مرگ است بے دیدار خویش بر مقام خود رسیدن زندگی ست ذات راہ بے پردہ دیدان زندگی ست	۱۴۸
۱۳	حق جان جہان است و جہاں جملہ بدن توحید ہمیں است، دگر حیلہ و فن	۱۵۲
۱۴	دل بدست آور کہ حج اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است کعبہ بنگاہ خلیل آذر است دل گزر گاہ جلیل اکبر است	۲۰۲، ۲۳۵

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۱۵	دلا بحلقہ رنداں ببزم عشق درآ کہ جرعہ ز شراب دہند ترا اگر بقا طلبی اولت فنا باید کہ تا فنا نشوی رہ نبی بری ببقاء	۲۴۳
۱۶	ذاکر ہمہ ذکر و ذکر مذکور شود	۱۵۵
۱۷	سر من از نالہ من دور نیست لیک چشم وگوش را آں نور نیست تن ز جان و جان زتن مستور نیست لیک کس را دید جاں دستور نیست	۱۵۲
۱۸	شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنی	۲۱۲
۱۹	کرا جوئی چرا در پیچ و تابی کہ او پیدا ست تو زیر عقابی تلاش او کنی جز خود نہ بینی تلاش خود کنی جز او نیابی	۱۴۷

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۲۰	کمال زندگی دیدار ذات است طریقش رستن از بند جہات است	۲۴۴
۲۱	معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد	۱۳۰
۲۲	محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست مر ز با نرا مشتری چوں گوش نیست	۱۵۳
۲۳	من تو شدم تومن شدی، من تن شدم تو جاں شدی تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری	۲۴۳
۲۴	من کیستم، تو کیستی عالم کجا است؟ درمیان ما و تو دوری چراست؟ من چرا دربند تقدیرم بگو؟ تو نمیری من چرا میرم بگو؟	۲۴۵
۲۵	موسی ز ہوش رفت بیک پرتو صفات تو عین ذات می نگری در تبسمی	۲۴۴
۲۶	ہرکہ رمز لا الہ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است	۴۸

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش
www.MinhajBooks.com

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۲۷	اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن	۱۴۸
۲۸	ادھر اللہ سے واصل' ادھر مخلوق میں شامل خواص اس برزخ کبری کو ہے حرف مشدد کا	۸۵
۲۹	میری میں ' فقیری میں' شاہی میں' غلامی میں کچھ کام نہیں بنتا بے جرات رندانہ	۲۲۱
۳۰	بخدا' خدا کا یہی ہے در' نہیں اور کوئی مفر مقر جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں	۹۳
۳۱	تری دنیا جہاں مرغ و ماہی میری دنیا فغاں صبح گاہی تیری دنیا میں میں محکوم و مجبور مری دنیا میں تیری بادشاہی	۱۴۵
۳۲	خدا وندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری	۲۳۶

www.MinhajBooks.com
منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۳۳	خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم میر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے	۲۳۴
۳۴	خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے	۲۱۹
۳۵	دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی	۷۹
۳۶	دور بیٹھا غبار میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا	۲۴۱
۳۷	زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی اب مگر کیا ہے؟ فقط مسئلہ علم کلام!	۲۲۱
۳۸	سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد	۱۴۳
۳۹	سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا تجھ کو وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل بے مدعا ہوتا	۸۱

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

نمبر شمار	اشعار	صفحہ
۴۰	صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے	۲۲۱
۴۱	عطار ہو 'رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی	۱۴۵
۴۲	عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور ' دل کا نور نہیں	
۴۳	کوئی کارواں سے ٹوٹا' کوئی بدگماں حرم سے کہ امیرِ کارواں میں نہیں ہے خوئے دل نوازی	۲۳۷
۴۴	گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے	۱۳۹
۴۵	مبتلائے درد کوئی عضو ہو ' روتی ہے آنکھ کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ	۲۳۴

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

www.MinhajBooks.com

نمبرشمار	اشعار	صفحہ
۴۶	متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی مقامِ بندی دے کر نہ لوں شان خداوندی	۸۲
۴۷	میری انتہائے نگارش یہی ہے ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں	۲۱۴
۴۸	ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا	۱۴۰
۴۹	ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہ روِ منزل ہی نہیں	۱۸۵
۵۰	ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی	۱۴۰
۵۱	یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا	۴۹

www.MinhajBooks.com

صفحہ	اشعار	نمبر شمار
۱۸۲	یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون	۵۲
۱۴۰	علموں بس کریں او یار	۵۳

www.MinhajBooks.com

کتابیات

www.MinhajBooks.com

کتاب	مصنف/متوفی	مطبوعہ/سن طباعت
امداد المشتاق	اشرف علی تھانوی، ۱۳۶۲	لاہور، مکتبہ اسلامیہ
بہجۃ اسرار	نور الدین ابو الحسن علی بن یوسف شطنوفیؒ۔ ولادت: ۶۴۴۔	مصر، مطبع مصطفے البابی الحلبی ۱۳۳۰ھ
تفسیر ابن کثیر	ابو الفداء عماد الدین بن کثیرؒ ۷۷۴ھ	بیروت، دار المعرفہ
تفسیر البیضاوی	امام ناصر الدین البیضاویؒ ۶۸۵ھ	بیروت الموسسۃ العلمی، ۱۹۹۰ء
تفسیر حقانی	ابو محمد عبد الحق حقانی دہلوی، ۱۸۹۳ء	لاہور۔ فیصل ناشران وکتب
تفسیر خازن	علی بن محمد خازنؒ ۷۲۵ھ	بیروت دار المعرفہ
تفسیر فتح العزیز	شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، ۱۲۳۹ھ	بھارت افغانی دار الکتب لال کنواں دہلی ۱۳۱۱
التفسیر الکبیر	امام فخر الدین رازی، ۶۰۶ھ	تہران دار الکتب العلمیہ
جامع ترمذی	محمد بن عیسٰی ترمذیؒ ۲۷۹ھ	ملتان، فاروقی کتب خانہ، ۱۹۸۳ء
الدرر المنتثرۃ	امام جلال الدین سیوطیؒ ۹۱۱ھ	مصر، مصطفٰی البابی الحلبی
الدر المنثور	امام جلال الدین سیوطیؒ ۹۱۱ھ	بیروت، دار المعرفۃ
الرسالۃ غوث اعظمؒ	خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، ۷۲۳ھ	کراچی۔ ادارہ معارف اسلامیہ
سبل الھدی والرشاد	محمد بن یوسف الشامیؒ ۹۴۲ھ	قاہرۃ احیاء التراث الاسلامیہ، ۱۴۱۰ھ
سنن ابن ماجہ	محمد بن یزید القزوینی، ۲۷۳ھ	کراچی، قدیمی کتب خانہ
سنن ابی داؤد	ابو داؤد سلیمان بن اشعث، ۲۷۵ھ	ملتان، مکتبہ امدایہ، ۱۳۱۶ھ
سنن الدارمی	عبد اللہ بن عبد الرحمٰن الدارمیؒ ۲۵۵ھ	بھارت، مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ھ
السنن الکبری	احمد بن حسین البیہقیؒ، ۴۵۸ھ	ملتان، مکتبہ نشر السنۃ
سنن نسائی	احمد بن شعیب النسائیؒ، ۳۰۳ھ	لاہور، فاروقی کتب خانہ
سیرت ابن ہشام	عبد الملک بن ہشامؒ ۲۱۳ھ	ملتان، مکتبہ فاروقی ۱۹۷۶ء
شرح المسلم	یحیٰ بن شرف النوویؒ ۶۷۶ھ	کراچی، مطبوعہ نور محمد، ۱۳۷۵ھ
شعب الایمان	احمد بن حسین بن علی البیہقیؒ، ۴۵۸ھ	بیروت۔
کتاب	مصنف/متوفی	مطبوعہ/سن طباعت
صحیح ابن خزیمہ	ابوبکر محمد بن اسحاق، ۳۱۱ھ	بیروت المکتبہ الاسلامیہ
صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل بخاریؒ ۲۵۶ھ	کراچی، قدیمی کتب خانہ ۱۳۸۱ھ
صحیح مسلم	ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیریؒ ۲۶۱ھ	کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۳۷۵ھ
فتوح الغیب	شیخ عبد القادر جیلانیؒ، ۵۶۱ھ	کراچی، مدینہ پبلشر کمپنی، ۱۹۸۴
فی ظلال القرآن	سید قطب، ۱۹۶۶ء	بیروت، احیاء التراث العربی، ۱۹۶۷ء
القرآن الکریم	منزل من اللہ	
الکشاف	محمود بن عمر زمخشریؒ ۵۳۸ھ	قاہرہ، مطبع الاستقامہ، ۱۹۵۳ء

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش
www.MinhajBooks.com

کنز العمال	علی متقی بن حسام الدینؒ ۹۷۵ھ	بیروت، دارالفقیہہ
مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ ۲۴۱ھ	بیروت، مکتبہ اسلامی، ۱۳۹۸ھ
مسند ابی یعلی	امام ابویعلی الموصلیؒ، ۳۰۷ھ	بیروت، دارالماعون التراث، ۱۴۰۶ھ
مصنف عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ھمام الصنعانیؒ، ۲۱۱ھ	کراچی، مجلس العلمی، ۱۹۶۳ء
معالم التنزیل	ابومحمد الحسین بن مسعود بغویؒ ۵۱۶ھ	بیروت، دارالمعرفۃ ۱۹۹۵ء
المعجم الکبیر	حافظ سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، ۲۶۰ھ	عراق، موصل مکتبہ الزہرہ الحدیثیہ
المفردات	امام راغب اصفہانیؒ، ۵۰۲ھ	ایران مکتبہ المرتضویہ، ۱۳۲۴ھ
الیواقیت والجواہر	عبدالوھاب شعرانیؒ، ۹۷۳ھ	مصر، مطبوعہ مصطفے البابی الحلبی ۱۳۷۸ھ

www.MinhajBooks.com